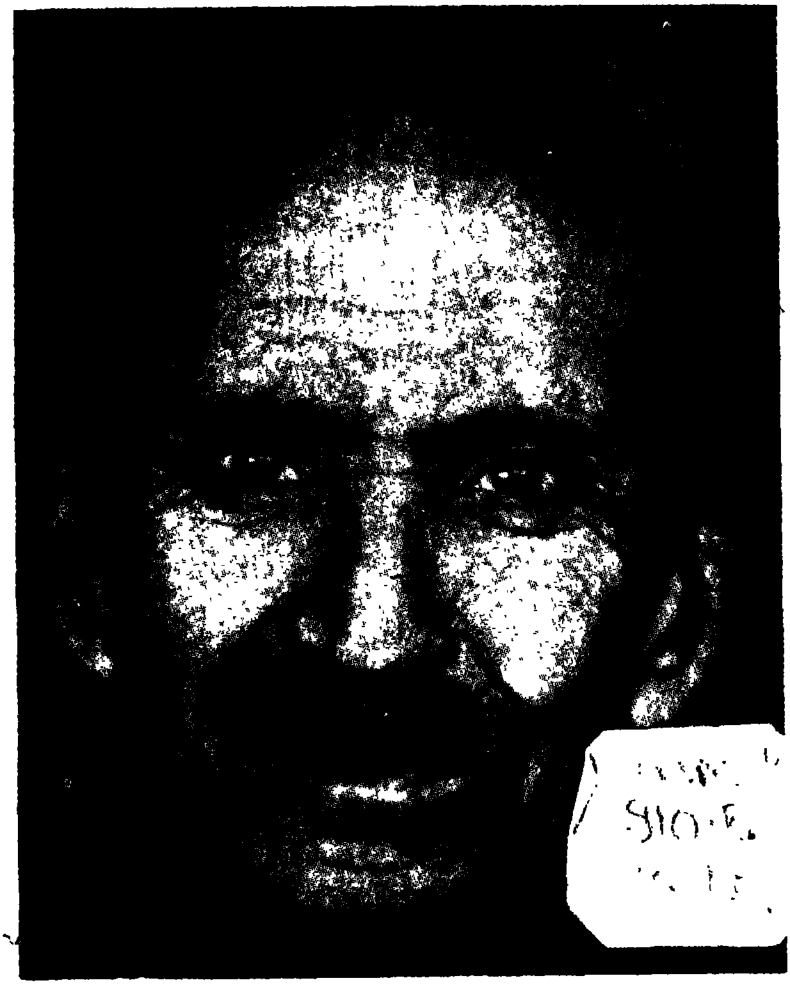
تحریک

بسمل سعیدی نمبر



جس شخص کی بسمل سے ملاقات ہوئی ہے
وہ شخص محبت کے پیمبر سے ملا ہے

...وں کے قاتل

...رابرٹ کنکوئسٹ

کی

...اور معلومات آفریں کتاب
...وں کی سرگزشت جو سوویت روس کے
...م کا شکار ہوئیں اور جلاوطنی و نسل کشی
...راحل سے گذریں۔

...مترجم: جلیس عابدی

قیمت: تین روپے

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before taking it out. You will be responsible for damages to the book discovered while returning it.

انسانی حقوق کیا ہیں؟

مشہور دانشور مورس کرانسٹن نے اپنی
اس معرکہ آرا تصنیف میں ان بنیادی انسانی حقوق
کی تشریح و تفسیر پیش کی ہے جن کے بغیر مہذب
زندگی کا تصور ممکن نہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے
کہ مختلف ملکوں میں ان کا اطلاق کس حد تک ہو سکا ہے۔

آخر میں اقوام متحدہ اور کونسل آف یورپ کے
جاری کردہ انسانی حقوق کے میثاق بھی کتاب میں شامل
کر دیے گئے ہیں۔

مترجم: جلیس عابدی

قیمت: عام ایڈیشن، چار روپے
" مجلد ایڈیشن: سات روپے

...یں گواہی دیتا ہوں

اناتولی مارچینکو

کی

المناک آپ بیتی

...مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی

DUE DATE

Cl. No. 811.705
168L53

Acc. No. 57828

Late Fine Ordinary books 25p. per day, Text Book Re 1 per day, Over night book Re 1 per day.

پنجاب اور آندھرا پردیش کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ تحریک دہلی

جلد: ۲۳	دسمبر ۱۹۷۵ء	شمارہ: ۹

بسمل سعیدی نمبر

مرتبین:

گوپال متل — مخمور سعیدی — پریم گوپال متل

سالانہ قیمت: دس روپے ○ اس شمارے کی قیمت: پانچ روپے

غیر ممالک سے

سالانہ: تیس شلنگ ○ فی کاپی: ۱۵ شلنگ

ترسیل زر کا پتہ

مینیجر ماہنامہ تحریک - ۹، انصاری مارکیٹ، دریا گنج۔ نئی دہلی

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر: گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس دہلی۔ کتابت: جمال گیاوی

16025

57828
6-10-1976

پیغام

عالیجناب فخر الدین علی احمد صاحب
صدر جمہوریۂ ہند، نئی دہلی

۱۵ راکتوبر ۱۹۷۵ء

مجھے یہ معلوم ہو کر مسرت ہوئی کہ ماہنامہ "تحریک" جناب بسمل سعیدی کی پچاس سالہ ادبی اور شعری خدمات کے اعتراف میں اپنا ایک خاص نمبر شائع کرنے جا رہا ہے۔ بسمل سعیدی صاحب سے اُردو والے سبھی بخوبی واقف ہیں۔ ان کا کلام اُردو شاعری کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہے۔

ماہنامہ "تحریک" کے اس نیک اقدام کے لیے میری نیک خواہشات قبول فرمائیے۔

فخر الدین علی

(فخر الدین علی احمد)

پیغام

جناب ہری دیو جوشی صاحب
وزیر اعلیٰ، حکومتِ راجستھان، جے پور

میں ادارۂ "تحریک" کو مبارکباد پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اس نے راجستھان کے ایک باکمال شاعر کے ادبی کارناموں کو ایک مستقل صورت میں منظرِ عام پر لانے کا فیصلہ کیا۔ میرے نزدیک یہ ایک ایسا اقدام ہے جس کی ہم سب کی طرف سے حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔

بسمل سعیدی صاحب اُردو کے نامور بزرگ شاعر ہیں۔ انھوں نے پورے ہندوستان میں راجستھان کا نام اونچا کیا ہے۔ اُردو دنیا اور خاص طور پر اہلِ راجستھان بسمل صاحب پر جتنا بھی فخر کریں، کم ہے۔

میری تمنا ہے کہ "تحریک" کا بسمل سعیدی نمبر اُردو ادب میں ایک یادگار اشاعت ثابت ہو۔

हरि देव जोशी

(ہری دیو جوشی)

پیغام

جناب کنھیّا لال پوسوال صاحب
وزیرِ داخلہ، حکومتِ ہریانہ، چنڈی گڑھ

۱۶ ستمبر ۱۹۷۵ء

اس خبر سے مسرت ہوئی کہ ماہنامہ "تحریک" غالب، اقبال اور جگر مرادآبادی جیسے عظیم شعرا پر خاص نمبروں کی اشاعت کے بعد، دورِ حاضر کے بزرگ اور بلند پایہ شاعر جناب بسمل سعیدی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک خاص نمبر شائع کر رہا ہے۔

شاعر کو قوموں کا معمار کہا جاتا ہے۔ بسمل صاحب نے گزشتہ پچاس برس میں اردو زبان اور اردو شاعری کی جو بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں انھیں دیکھتے ہوئے آپ کی جس قدر عزت افزائی کی جائے، وہ کم ہوگی۔

میں جناب گوپال متل صاحب اور ان کے رفقائے کار کے اس قابلِ ستائش اقدام کی قدر کرتا ہوں۔ خاص نمبر اپنے مقصد میں کامیاب ہو، یہ میری دلی خواہش ہے۔

کے۔ ایل۔ پوسوال
(کنھیّا لال پوسوال)

پیغام

جناب لال چند پرارتھی صاحب چاند
وزیر نشریات حکومت ہماچل پردیش شملہ

۱۵ نومبر ۷۵ء

مجھے یہ اطلاع پاکر بڑی مسرت ہوئی کہ ماہنامہ "تحریک" جناب بسمل سعیدی کی نصف صدی پر مشتمل شعری اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے۔ اپنے فن کاروں کی ان کی زندگی میں قدر افزائی کسی معاشرے کی اپنی زندگی کا ثبوت ہوا کرتی ہے۔ آپ نے یہ نمبر شائع کر کے گویا پورے معاشرے کی طرف سے ایک فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔ میری تمنا ہے کہ اس نمبر کو قبولِ عام حاصل ہو۔

(لال چند پرارتھی چاند)

پیغام

جناب سیّد فاروق حسن صاحب
وزیرِ مملکت برائے تعلیم و قانون و اوقاف، حکومتِ راجستھان، جے پور
۱۵ ستمبر ۱۹۷۵ء

یہ انتہائی مسرت کی بات ہے کہ ماہنامہ "تحریک" اُردو کے مایۂ ناز شاعر جنابِ بسمل سعیدی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اپنا خاص نمبر شائع کر رہا ہے۔

بسمل صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں وہ ملک گیر شہرت کے مالک ہیں اور اپنے ہمعصر شعراء کی صف میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

بسمل صاحب نے زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا ہے اور اپنے مشاہدات اور محسوسات کو پورے فنّی لوازمات کے ساتھ الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ ان کا کلام اس کا بھی شاہد ہے کہ وہ اپنے دل میں ملک و قوم کا سچّا درد رکھتے ہیں۔

بسمل صاحب نے جن ادبی، فنّی اور انسانی منزلوں کو سر کیا ہے اُس پر نہ صرف راجستھان بلکہ پورا ملک بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

میں ادارہ "تحریک" کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ اس نے مُردہ پرستی کی دیرینہ روایت کو توڑ کر بسمل صاحب کی زندگی میں ان کی ادبی خدمات کو سراہنے کا جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ میں اس خاص نمبر کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

فاروق حسن

(سیّد فاروق حسن)

پیغام

جناب بنواری لال صاحب
وزیر مملکت برائے امور جیل خانجات حکومت راجستھان جے پور
۱۱ر نومبر ۷۵ء

مجھے دلی مسرت ہے کہ ماہنامہ "تحریک" ہمارے بزرگ اور محترم شاعر بسمل سعیدی صاحب کی ادبی اور شعری خدمات کے اعتراف میں اپنا خاص نمبر شائع کر رہا ہے۔ بسمل صاحب ان مقتنماتِ روزگار میں سے ہیں جن کے لیے میر نے کہا تھا:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

بسمل صاحب کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں اپنے تاثرات ایک مضمون کی شکل میں میں نے قلمبند کیے ہیں جو میں آپ کو بھجوا رہا ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ "تحریک" کا خاص نمبر اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔

بنواری لال
(بنواری لال)

پیغام

جناب وشنودت شرما صاحب

صدر راجستھان ساہتیہ اکاڈمی سنگم، اودے پور

یکم نومبر ۱۹۷۵ء

حضرت بسمل سعیدی ہمارے ملک کے ممتاز اور نامور شاعر ہیں۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ ادبی سرگرمیوں میں گزرا ہے۔ ادبی دنیا میں انھیں جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ ان کے باکمال فنکار ہونے کی دلیل ہے۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف سبھی کو ہے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ راجستھان کے اس مایۂ ناز فرزند کی شخصیت اور فن پر "تحریک" کا خاص نمبر ترتیب دے رہے ہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ آپ کی یہ کوشش کامیاب ہو۔ امید ہے کہ "تحریک" کا یہ نمبر بسمل صاحب کے تمام فنی اور ادبی پہلوؤں کو اجاگر کرے گا۔

راجستھان ساہتیہ اکاڈمی دسمبر ۷۵ء میں اپنے سالانہ جلسے کے موقع پر بسمل صاحب کو اعزاز پیش کرے گی۔

(وشنودت شرما)

گوپال مِتّل

پیش لفظ

بسملؔ صاحب کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں کچھ لکھنے بیٹھا تو بے ساختہ فارسی کا یہ شعر یاد آگیا :

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

بسملؔ صاحب کی شخصیت ہمہ جہت ہے اور ہر ہمہ جہت شخصیت تھوڑے بہت تضاد کی حامل ہوتی ہے۔ اقبالؔ نے مارکس کے لیے لکھا تھا :

قلبِ او مومن دماغش کافر است

بسملؔ صاحب قلب اور دماغ دونوں ہی سے مومن ہیں لیکن ان کے اعمال بھی مومنانہ ہیں، یہ دعویٰ نہ انھیں ہے نہ ان کے کسی مدّاح کو۔ ان کی راسخ العقیدگی کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور "کافر ما جرائیہا" کے بارے میں بھی لیکن یہاں مجھے صرف ان کی شاعری سے بحث ہے۔ بسملؔ صاحب کا ایک مقطع ہے :

کلمہ گو کہیں پھرتے ہیں زباں سے بسملؔ
آج بھی نام وہی وردِ زباں ہے کہ جو تھا

کسی وقت ترقی پسندی کے مدعیوں کے پاس تخویف و ترغیب کے تمام حربے موجود تھے لیکن یہ حربے بسملؔ صاحب کو جادۂ حرمتِ فن سے منحرف کرنے میں ناکام رہے اور ادب کی کلاسیکل اقدار پر بسملؔ صاحب کا جو ایمان تھا وہ اسی طرح مستحکم رہا۔

اگست ۱۹۵۳ء کے تحریک میں ان کے بارے میں میں نے لکھا تھا :

" اس کے ظاہر و باطن میں بڑا فرق ہے۔ اس لیے ایک اعتبار سے اسے " منافق " کہہ

سکتے ہیں۔ عام طور پر منافقوں کا ظاہر روشن اور باطن تاریک ہوتا ہے۔ لیکن اس شخص کا ظاہر تاریک اور باطن روشن ہے جامع مسجد کے آس پاس سڑک پر گھومتے ہوئے اسے دیکھیے تو گمان ہو کہ:

آوارہ و مجنونے رسوا سر بازارے

لیکن جونہی وہ اپنا کوئی شعر سناتا ہے، اس کی شخصیت کا جادو اپنا کام کر جاتا ہے اور اس سے پیار کرنے کو جی چاہتا ہے، اختر شیرانی اور عبدالحمید عدم کے بعد وہ بسمل ملا ہے جس سے راقم الحروف کو محبت ہوئی۔ غزل بہت پاکیزہ کہتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اس کی نظم محاسن شعری سے محروم ہوتی ہے۔"

جس وقت یہ سطور لکھی گئی تھیں بزم سخن اتنی ویران نہیں تھی۔ امجد حیدر آبادی، یگانہ، اثر لکھنوی، جگر مراد آبادی سبھی موجود تھے لیکن آج جب ان پر نظر پڑتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پرانی بزم سخن کی وہ آخری شمع ہیں۔

بسمل صاحب کی پختگی کلام اور ان کی استادانہ حیثیت سے ان کے دشمن بھی انکار نہیں کرتے لیکن پختہ کلامی اور استادی ان دنوں جرائم کی فہرست میں شامل ہیں۔ کسی شاعر کو پختہ گو اور استاد کہنے کا مطلب بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا کلام جدت اور تخلیقی وصف سے محروم ہے۔ یہ دراصل ان بے عمل گو شاعروں کے جذبۂ انتقام کا اظہار ہے جنھوں نے اپنے معائب کو اوصاف اور دوسروں کے اوصاف کو معائب قرار دینے میں ریاضت کی حد تک مشق کی ہے۔ اس کی بہت کچھ ذمہ داری مشاعروں کے موجودہ ماحول پر بھی ہے۔ مجھے ایسے مشاعروں میں شرکت کا شرف حاصل ہوا ہے جہاں سامعین تو کجا نو عمر شعرا بھی اساتذہ کو داد دینے کی جرأت نہیں کرتے تھے اور اساتذہ ایک دوسرے کی تاک میں رہتے تھے کہ کسی سے کوئی غلطی ہو تو مصرعہ دہرا کر اسے جتا دیا جائے۔

ان دنوں مشاعروں کا یہ حال ہے کہ شاعر کو ایسے لوگوں سے داد طلب کرنا پڑتی ہے جو شاعری کے رموز تو کجا اردو زبان ہی سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے ستم بالائے ستم یہ کہ ان میں سے بیشتر نشے میں بھی دھت ہوتے ہیں۔ انھیں جو چیز مرعوب کرتی ہے وہ شاعر کی ہیئت کذائی یا اس کی آواز کا لوچ ہے۔ محاسن شعری پر ایسے ماحول میں کس کی نظر جاتی ہے۔

بسمل صاحب کے پاس جو جنس ہے، اس کے خریدار اٹھ چکے۔ عدم پذیرائی ان کا مقدر ہے اور میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ اس پر قناعت کیے ہوئے ہیں۔ ویسے عدم پذیرائی اربابِ فن کا ہمیشہ مقدر رہی ہے۔ جس غزل کا یہ شعر ہے:

اسپِ تازی شدہ مجروح پذیر پالاں
طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خر می بینم

اسے حافظ کے کلام میں اگر الحاقی بھی سمجھا جائے تو بھی اتنا تو ہے ہی کہ وہ اسی دور کے کسی شاعر کی غزل ہوگی۔ لیکن فرق یہ ہے کہ اس زمانے میں پذیرائی اور عدم پذیرائی کے پیمانے موجودہ دور سے مختلف ہوتے تھے۔ اس زمانے کو چھوڑیے غالب کے دور میں بھی غالب کو سرے سے نظر انداز نہیں کیا گیا۔ صرف اتنا تھا کہ ذوق کو ان پر فوقیت دی جاتی تھی اور جن لوگوں نے قصائدِ ذوق کا مطالعہ کیا ہے، وہ ذوق کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ موجودہ دور کی بے بصیرتی کا یہ عالم ہے کہ ایک خام گو شاعر کو شاعرِ اعظم قرار دیا جا سکتا ہے اور جس شاعر کے کلام میں جملہ محاسنِ شعری موجود ہوں، وہ مستحقِ نظر اندازی ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ بسمل صاحب بے بصیرتی کے اسی دور میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے وسیع پیمانے پر ان کی پذیرائی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن پرانا معاشرہ کافی سخت جان ہے۔ آئندہ صفحات میں جن حضرات کے مضامین آپ پڑھیں گے ان کا روحانی رشتہ اسی معاشرے سے ہے۔ ان کے اعترافِ کمال کے سامنے ہزاروں شاعروں کی واہ واہ ہیچ ہے۔ ان تمام مظالم کے باوصف جو موجودہ معاشرے نے بسمل صاحب پر کیے ہیں، ان حضرات کی طرف سے اپنے کمال کے اعتراف کے بعد بسمل صاحب بجا طور پر محسوس کر سکتے ہیں کہ انھوں نے تکمیلِ فن کے لیے جو ریاضت کی وہ اتنی رایگاں نہیں تھی۔

بسمل صاحب کی بیاض کا ایک صفحہ

کوئی رہرو یا کوئی رہبر تو کیا کہیے مجھے
اُن کی راہِ عشق میں اک نقشِ پا کہیے مجھے

میں نے خود اپنا سفینہ غرقِ طوفاں کر دیا
نا خدا نے جب کہا مجھ سے خدا کہیے مجھے

میں نے راہِ عشق میں کتنے بنا ڈالے ہیں خضر
راہزن کہتا ہے مجھ سے رہنما کہیے مجھے

آپ کے منہ سے برا مجھ کو نہیں کہتے رقیب
آپ ان کے سامنے اک دن برا کہیے مجھے

جیسے اک بھولے ہوئے خواب کا آئے خیال
دور سے آتی ہوئی کوئی صدا کہیے مجھے

خلد پا انداز ہے جس کا رہے کہتے ہیں عرش
عرش کہتا ہے کہ ان کا نقشِ پا کہیے مجھے

بسمل

◄ آئینہ بہ آئینہ ►

جس شخص کی بسملؔ سے ملاقات ہوئی ہے
وہ شخص محبّت کے پیمبر سے ملا ہے

- نثار احمد فاروقی —— بسملؔ سعیدی، خاندانی پس منظر
- مَیکش اکبرآبادی —— خوش خوالسان، خوش گو شاعر
- ساحر ہوشیار پوری —— سیّد عیسیٰ میاں بسملؔ
- مخمور سعیدی —— بلّاجی
- اسلم پرویز —— مہر و محبتِ تمام
- پریم گوپال متّل —— بسملؔ صاحب

نثار احمد فاروقی

بسمل سعیدی —— خاندانی پس منظر

بسمل سعیدی عہدِ حاضر میں اُردو کے کہنہ مشق استاد اور بزرگ شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت اور شعری خدمات سے دِلّی والے خاص طور پر اچھی طرح متعارف ہیں کیونکہ اس شہر کو بسمل کے وطن ثانی ہونے کا شرف حاصل ہے، مگر عام طور پر اُردو شاعری کے پرستار بھی ان کے نام اور کلام سے ناآشنا نہیں ہیں کیونکہ وہ بسمل کا کلام رسالوں اور اخباروں میں پڑھتے ہیں، ریڈیو پر سنتے ہیں اور مشاعروں میں اس سے محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن شاید بہت ہی کم حضرات ان کے خاندانی پس منظر سے واقف ہوں، اس لیے یہاں اُن کے خانوادے کا سرسری تعارف پیش کر رہا ہوں۔

ہر انسان کی شخصیت اور افکار کی تعمیر اور نشو و نما میں بہت سے محسوس اور غیر محسوس محرکات کارفرما رہتے ہیں۔ اسے وراثت میں جو کچھ ملتا ہے یا اپنے خاندانی ماحول میں جو کچھ وہ دیکھتا ہے، یا جن بزرگوں کی آغوشِ تربیت میں آنکھ کھولتا ہے اُن کے اثرات سب سے زیادہ دیرپا، مثبت اور دُور رس ہوتے ہیں۔ بسمل سعیدی نے راجستھان کی ایک چھوٹی سی مگر نیک نام ریاست ٹونک میں پرورش پائی۔ یہ وہی ریاست ہے جس کے حکمراں غالب اور مومن کے ممدوح رہے ہیں۔ اس ریاست نے سیّد احمد شہید بریلوی کی تحریکِ جہاد کو پروان چڑھایا تھا اور پھر سرحد سے واپس آنے والے قافلوں کو پناہ دی تھی۔ اسی ٹونک نے مفتی عبداللہ ٹونکی، مفتی محمود الحسن، حافظ محمود شیرانی، مولانا احمد علی سیماب، اور حکیم برکات احمد جیسے جیّد علماء اور اختر شیرانی، بسمل سعیدی اور مخمور سعیدی جیسے نامور شعراء پیدا کیے۔ شمالی ہند کی جن ریاستوں نے پچھلی صدی میں علوم مشرقیہ کی ترویج و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا، ان میں ریاست ٹونک کی ممتاز حیثیت رہی ہے۔

شمالی ہند ہی کی دوسری معارف پرور ریاست رام پور تھی جس نے غالب، داغ، امیر اور جلال جیسے شعرا کی قدر دانی کی اور علوم اسلامیہ کے انتشار اور فروغ کی اچھی روایات قائم کیں۔ بسمل کا خاندان رام پور ہی سے ٹونک کو منتقل ہوا تھا۔

دراصل بسمل سعیدی کے آبا و اجداد دہلی کے رہنے والے تھے اور یہاں وہ احمد آباد یا پنجاب سے آئے ہوں گے کیوں کہ اُن کا شجرۂ نسب حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے ۱۶ واسطوں سے مل جاتا ہے۔ بسمل سعیدی، بن سعید احمد، بن احمد علی، بن محمد علی، بن عنایت علی، بن مفتی فضل علی بن سید میر افضل، بن سید علی، بن سید محمد بن سید احمد بن سید عبدالرزاق، بن سید میران جیو کمبل پوش، بن سید میر جلال، بن سید حسین، بن سید برہان الدین قطب عالم گجراتی، بن سید ناصر الدین، بن سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ ——— مؤخر الذکر کا شجرۂ نسب ۱۷ واسطوں سے حضرت سید الشہدا، حسین علیہ السلام تک منتہی ہوتا ہے۔

مخدوم جہانیاں نویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔ انھیں متعدد خانوادوں میں بیعت و اجازت حاصل تھی۔ ہندستان سے باہر بھی انھوں نے سیاحت کی تھی اور ان کے ملفوظات بھی "سراج الہدایہ" اور "ملفوظا المخدوم" کے نام سے جمع کیے گئے ہیں۔ آخری کتاب کا اُردو ترجمہ بھی دو ضخیم جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ ان کی اولاد میں سے کون دہلی آکر آباد ہوا یہ کہنا دشوار ہے لیکن بعض قلمی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر عہد مغلیہ میں سید میر افضل اور ان کے بیٹے سید فضل علی دہلی میں موجود تھے اور افتا کا منصب ان کے پاس تھا۔ اُن کے بیٹے مولوی سید عنایت علی بھی دہلی ہی میں پیدا ہوئے تھے اور غالباً یہی پہلے پہل رام پور کو منتقل ہوئے تھے۔ اُن کا مزار رام پور اور بریلی کے درمیان ایک گانو "رلک" نامی میں بتایا گیا ہے۔ مولوی عنایت علی کے تین فرزند تھے۔ سید حیدر علی، میر حسن علی، اور میر محمد علی واعظ۔

جن حضرات نے سید احمد شہید بریلوی کی تحریکِ جہاد کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ مولانا حیدر علی رام پوری اور مولانا محمد علی رام پوری کے ناموں سے ضرور آشنا ہوں گے۔ ان دونوں بزرگوں کے حالات 'سوانح احمدی' وغیرہ قدیم کتابوں کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تالیف "سیرۃ سید احمد شہید" اور احمد علی خان شوق کے تذکرۂ "کاملانِ رام پور" میں ملیں گے۔

اس کے علاوہ غلام رسول مہر کی ضخیم اور قابلِ قدر تاریخ "سید احمد شہید" اور سرگذشتِ مجاہدین جسے پروفیسر کینٹول اسمتھ نے بجا طور پر اُردو تاریخ نگاری میں ایک نیا سنگ میل بتایا ہے —— یہ سب ماخذ سمل کے بزرگوں کے علم و فضل، ورع و تقویٰ اور حمیتِ ملی کی گواہی دے رہے ہیں۔ سید احمد شہید کے کچھ مکتوباتِ فارسی مولوی محمد جعفر تھانیسری کی تالیف "تواریخِ عجیبہ" (طبع ۱۳۰۰ھ) کے ساتھ چھپ چکے ہیں، دوسرے مجموعوں کا حال مہر اور ندوی کی کتابوں میں موجود ہے اور دو قلمی نسخے پٹنہ یونیورسٹی لائبریری اور کتب خانۂ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں بھی محفوظ ہیں۔ یہ دونوں میری نظر سے گزرے ہیں اور نسخۂ سالار جنگ کی تفصیل عرصہ ہوا رسالہ "برہان" دہلی میں طبع کرا چکا ہوں۔ یہ تذکرہ یہاں بے محل نہیں تھا۔ ان خطوط کے مطالعے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ مولانا حیدر علی اور مولانا محمد علی رام پوری اس تحریکِ جہاد کے رُکنِ رکین تھے۔

مولانا حیدر علی رام پوری سید احمد شہید کے جلیل القدر خلیفہ تھے اور ان کی طرف سے بیعتِ جہاد لیا کرتے تھے۔ مولانا حیدر علی کو اپنے زمانے کے بہترین اساتذہ سے تحصیلِ علم کے مواقع بھی ملے تھے۔ چنانچہ انھوں نے لکھنؤ میں ملا محمد مبین سے اور رام پور میں سید غلام جیلانی رفعت سے تعلیم حاصل کی تھی۔ بعد کو مؤخر الذکر کی صاحبزادی سے ان کا نکاح بھی ہوا۔ مولوی غلام جیلانی کے تلامذہ میں ملا غیاث الدین رام پوری مؤلف "غیاث اللغات" جیسے نامور حضرات بھی ہوئے ہیں۔ پہلے ان کا تخلص بیدم تھا چنانچہ قدرت اللہ شوق کے تذکرۂ طبقات الشعراء (تالیف ۱۱۸۸ھ) میں ان کا حال بیدم تخلص کے تحت ہی ملتا ہے اور خاصا انتخابِ کلام بھی وہاں درج ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اردو میں بیدم اور فارسی میں رفعت تخلص رکھتے ہوں۔ دہلی آکر مولانا حیدر علی نے علومِ دینیہ کے علاوہ طبِ یونانی کی بھی تکمیل کی تھی اور یہاں انھیں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی مفسرِ قرآن، اور حکیم محمد شریف خاں جیسے باکمالوں سے استفادے کا موقع ملا تھا۔

یہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے خاندان سے فیض یاب ہونے کا اثر تھا کہ تعلیم سے فارغ ہوکر مولوی حیدر علی نے اپنی زندگی کو جہاد کے لیے وقف کر دیا۔ پہلے وہ عملاً اس تحریک کو فروغ دینے میں کوشاں رہے اور آخر میں معرکۂ بالاکوٹ کے دردناک انجام کے بعد انھوں نے بقیہ ساری زندگی درس و تدریس میں گزار دی۔ نواب احمد علی خاں والیِ رامپور (متوفی

۱۸۴۰ء) نے انھیں کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی تھی۔ سید احمد شہید نے نواب احمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔

"آنچہ رقم فرمودہ اند کہ بخدمتِ بابرکت جناب ہدایت مآب افادت انتساب مقربِ بارگاہ ربِ قوی، مولانا سید حیدر علی صاحب معاملۂ مسنونہ (بیعت) بجا آوردند از استماعِ آن فرحت بر فرحت افزود"

ایک اور خط میں الخ مولانا حیدر علی صاحب کو سید احمد شہید نے ان القاب سے یاد کیا ہے۔

"خدمت سراپا برکت مولوی صاحب، معدنِ علوم و منبعِ فہوم، موردِ فیوضِ ربانی مخزنِ اسرارِ رحمانی، حامیِ انوارِ سنت شہابِ و ماحیِ آثارِ بدعت ظلماءِ ہدایت مآب کمالات انتساب، مقربِ بارگاہ ربِ قوی، مولوی سید حیدر علی مدّ اللہ ظلالَ افاضتہٖ علی رؤوسِ المستفیضین الی یوم الدین ..."

اس سے معلوم ہوگا کہ سید احمد صاحب، مولوی حیدر علی کے بارے میں کیا خیالات رکھتے تھے اور اُن کی شخصیت کا کس درجہ اعزاز و اکرام کرتے تھے۔ نواب وزیر الدولہ والیِ ٹونک بھی اُن کے مرید تھے۔ معرکۂ بالاکوٹ کے بعد جب مولانا حیدر علی نے ٹونک میں سکونت اختیار کی تو ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں نواب وزیر الدولہ نے انھیں دیوانِ ریاست کے عہدے پر فائز کر دیا تھا۔ اس طرح آپ دو سال تک ریاست کے کل ملک و مال کے مدار المہام رہے۔ ۱۲۶۲ھ میں دیوانی کا عہدہ منشی ظہور علی عباسی کے سپرد کر کے مولوی حیدر علی نے مال پورہ دروازے کے باہر شمالی سمت میں واقع ایک مسجد کو اپنی علمی اور تدریسی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔ اُن کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی جن میں نواب صدیق حسن خاں، جو بعد کو بھوپال کے مدار المہام ہوئے، اور نفائس اللغۃ کے مؤلف قاضی اوحد الدین بلگرامی جیسے باکمال بھی شامل ہیں۔

مولوی حیدر علی کا انتقال ۲۹ر ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ بروز دوشنبہ ظہر کے وقت ہوا۔ مدرسہ کے قریب ہی گورستان میں دفن کیے گئے۔

مولانا حیدر علی نے احیائے سنت کے مقصد سے کچھ رسایل بھی تصنیف کیے اُن کی مندرجہ ذیل تصانیف کا ہمیں سراغ ملتا ہے:

۱۔ صیانۃ الناس عن وسوسۃ الخناس (اُردو) یہ مولوی فضلِ رسول بدایونی کے رسالہ "معقولاتِ عشرہ" کا جواب ہے جس میں انھوں نے شاہ اسماعیل شہید کی مشہورِ زمانہ کتاب "تقویۃ الایمان" پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ مولانا حیدر علی نے اُن کا ردّ لکھا۔ یہ رسالہ ۱۲۷۰ھ میں شایع ہو چکا ہے۔

۲۔ رسالہ اِثباتِ رفع الیدین فی المواضع الاربعہ من المقصود (فارسی) اس رسالے کا حوالہ رحمٰن علی کے "تذکرہ علمائے ہند" میں ملتا ہے اور یہ سید محبوب علی دہلوی کے کسی رسالے کی تردید میں لکھا گیا تھا۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس میں مقلد اور غیر مقلد حضرات کے درمیان نماز میں رفع یدین کرنے نہ کرنے کے اختلافات زیر بحث آئے ہوں گے۔

۳۔ رسالہ نظام الملۃ ودافع الجلۃ یہ رسالہ بھی غالباً فارسی زبان میں تھا اور اس میں بھی تقلید کے جائز ہونے نہ ہونے کی بحث تھی۔

۴۔ جُنگِ مسائل اس میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی مولانا حیدر علی اور دوسرے علماء کے فتاوی جمع کیے گئے تھے۔ چند اور مختصر رسائل بھی تھے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ "فتاوی مولوی حیدر علی" کے نام سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کتب خانے میں ملتا ہے۔

۵۔ اقامتِ سنّت باماتتِ بدعت (فارسی) یہ خلیل الرحمٰن رام پوری کے رسالہ موسومہ "رسم الخیرات" کی تردید ہے جس میں ایصالِ ثواب اور فاتحہ وغیرہ کو بدعت کہنے والوں کا ردّ کیا گیا تھا۔ مولوی حیدر علی نے اس رسالے کی لفظ بہ لفظ تردید لکھی تھی۔ یہ ۱۲۶۴ھ کی تصنیف ہے اور اس رسالے میں کچھ ایسا مواد بھی ملتا ہے جس سے سیّد احمد شہید کی تحریکِ جہاد پر روشنی پڑتی ہے۔

۶۔ رسالہ در رسوم موتیٰ یہ بھی خلیل الرحمٰن رام پوری کے کسی رسالے کی تردید میں ہے۔ اور اس میں میّت کی رسوم کو بدعت ثابت کیا گیا ہے۔

یہ تو اولادِ معنوی کا حال تھا، اولادِ جسمانی میں مولانا حیدر علی کے دو صاحبزادے سیّد یحییٰ اور سیّد زکریا تھے، دونوں کا انتقال عالمِ شباب میں ہوا۔ سیّد زکریا کے بیٹے

محمد یوسف بھی لاولد فوت ہو گئے تھے اس لیے اولادِ نرینہ سے سلسلہ جاری نہیں رہا۔ اناث میں مولانا کی تین بیٹیاں طیبہ، سکینہ، اور نجیبہ تھیں۔ اُن کی اولاد اب بھی باقی ہے۔

مولانا حیدر علی کے چھوٹے بھائی مولانا محمد علی ۱۲۰۰ھ میں رام پور ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی اپنے زمانے کے مُسلّم الثّبوت استادوں سے علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ سید احمد صاحب کی تحریکِ جہاد سے وابستہ ہوئے تو انھیں سب سے پہلے خُراساں کی طرف داعی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ کچھ زمانے کے بعد سید احمد صاحب نے انھیں ہندستان میں طلب کیا تو یہ سندھ کے راستے ہوتے ہوئے آئے۔ سید صاحب نے انھیں دکن کی سمت روانہ کیا۔ چنانچہ حیدرآباد دکن پہنچے وہاں مہاراجہ چندو لال سے ملاقات کی۔ مہاراجہ نے ڈھائی سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کرنے کے علاوہ دو ہزار روپیے ضیافت کے نام پر بھی نذر کیے۔ حیدرآباد میں جگہ جگہ مولانا محمد علی کے وعظ ہوئے جن سے سارے شہر میں نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ نواب مبارز الدولہ نے اُن سے بیعت کر کے تمام مناہی سے توبہ کر لی۔ نواب منیر الملک نے بھی ملاقات کی تھی مگر بیعت کا حال معلوم نہیں۔ ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء) میں وہ کرنول، کڑپہ، اُودگیر وغیرہ ہوتے ہوئے مدراس پہنچے جو اُس وقت چنیا پٹن کہلاتا تھا۔ کرناٹک کے خاندانوں میں مولانا محمد علی کے ذریعے ہی تحریکِ جہاد پہنچی تھی۔ نواب محمد خاں عالم خاں تہوّر جنگ نے اُن کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی۔ مولانا محمد علی کی تقریر میں ایسا جادو تھا کہ ہزاروں کا مجمع ڈھاڑیں مار کر رونے لگتا تھا اور اثر کا یہ حال تھا کہ مدراس کے شراب فروشوں نے حکومتِ وقت کو یہ عرضداشت پیش کی تھی کہ "ہم سیندھی اور شراب کا مقررہ محصول ادا نہیں کر سکتے۔ اس شہر میں ایک ایسا مولوی آیا ہوا ہے کہ اُس نے تمام مسلمان خریداروں کو سیندھی اور شراب نوشی سے منع کر دیا ہے اس واسطے سیندھی اور شراب کا بکنا بند ہو گیا ہے۔" جب صاحب کلکٹر بہادر نے پولیس کے ذریعے تحقیقات کرائی تو معلوم ہوا کہ کلالوں کا استغاثہ بالکل درست ہے۔

مولانا محمد علی مدراس ہی میں تھے کہ انھیں بالاکوٹ (پنجاب) کے معرکے کا افسوسناک انجام معلوم ہوا اور وہ مدراس میں اپنے خلفاء نامزد کر کے پانی کے جہاز سے کلکتہ آئے اور وہاں سے اپنے وطن رام پور کا رُخ کیا۔ چار پانچ سال یہاں رہ کر ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء) میں حج بیت اللہ کے ارادے سے نکلے مگر انگریزوں کو خوف تھا کہ وہ ملک سے باہر رہ کر تحریکِ آزادی کو اور بھی اطمینان سے منظم کر سکتے ہیں اس لیے اُنھیں ہندستان چھوڑنے کی اجازت نہیں ملی۔

۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں ۵۰ سال کی عمر پاکر سید احمد بریلوی کی شہادت سے بارہ سال بعد انھوں نے الٰہ آباد میں انتقال کیا۔

مولانا محمد علی کا عقد سید ابن علی فرخ آبادی کی دختر امۃ الفاطمہ سے ہوا تھا جس کے بطن سے دو صاحبزادے احمد علی اور سید ابراہیم تولد ہوئے۔ ایک دختر بھی تھیں جن کا نام صدیقہ تھا۔ اُن کا عقد پہلے سید احمد شہید کے بھانجے حسن مثنّیٰ عرف سید موسیٰ سے ہوا تھا لیکن غالباً رخصتی نہ ہوئی۔ دوسرا نکاح سید محمد یعقوب (متوفی ۱۲۸۷ھ ۔ ۱۸۷۰ء) سے ہوا جو سید احمد شہید کے برادر بزرگ سید ابراہیم کے صاحبزادے تھے۔

اُن کے بڑے بیٹے سید احمد علی کو علمی دنیا احمد علی سیماب ٹونکی کے نام سے جانتی ہے۔ یہ ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱ء) کو رام پور میں پیدا ہوئے تھے۔ مولانا احمد علی سیماب نے سب سے پہلے حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی[7] (متوفی ۷۵۸ھ) کے ملفوظات "خیر المجالس" کا اردو ترجمہ 'سراج المجالس' کے نام سے کیا تھا جو ۱۸۹۸ء میں مسلم پریس جھجھر سے شائع ہوا۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن چند سال قبل نسیم بکڈپو لکھنؤ نے چھاپا ہے۔ اُن کا دوسرا علمی کارنامہ "تزک جہانگیری" کا اُردو ترجمہ ہے جو اگرچہ قدیم نثری اسلوب میں ہے مگر آج بھی وہی مستند ترجمہ مانا جاتا ہے اور اسے بھی چند سال قبل لاہور میں دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ اس کی تلخیص میں نے نقوش کے آپ بیتی نمبر (۱۹۶۴ء) میں بھی چھپوائی تھی۔

مولانا احمد علی اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں یکساں قدرت کے ساتھ شعر کہتے تھے اور اپنے عہد کے علوم رسمیہ میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ انھوں نے ۶ جمادی الثانیہ ۱۳۱۸ھ (یکم اکتوبر ۱۹۰۰ء) بروز دوشنبہ ٹونک میں انتقال کیا۔ یہ ہندی مہینا کنوار کی آخری تاریخیں تھیں۔ انھیں مولانا حیدر علی کے قبرستان میں شمالی دروازے سے تقریباً تین گز کے فاصلے پر دفن کیا گیا تھا۔ اب قبر کا کیا حال ہے اس کا علم نہیں، لیکن اس وقت ان کی قبر پر سرخ سنگ ریزے بچھائے گئے تھے۔ مولوی سعید احمد ٹونکی نے تاریخ وفات اس طرح کہی تھی:

مولوی احمد علی سیماب مُرد ـــ با مُغنے جام خوشی اخلاقی نماند

آمد ایں تاریخ مستاں را بہوش ـــ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

۱۸ ۱۳ ھ

عجیب اتفاق یہ ہے کہ اسی سال اُردو کے مشہور شاعر امیرؔ مینائی کا انتقال بھی ہوا تھا اور ان کے انتقال کی تاریخ بھی کسی نے اسی مصرعے سے نکالی ہے۔

مولانا احمد علی کا عقد مولوی سید انعام اللہ رضوی بریلوی کی دختر مریم سے ہوا تھا ان کے بطن سے سید احمد اور عبدالعلی دو فرزند پیدا ہوئے۔ مؤخرالذکر اپنے باپ کی حیات ہی میں ایک فرزند چھوڑ کر گذر گئے تھے جو نو عمری ہی میں فوت ہوا۔ غالبؔ کے ایک معاصر اور مکتوب الیہ گل محمد خاں ناطقؔ مکرانی کچھ زمانے تک ٹونک میں بھی رہے تھے اور وہاں انھوں نے مولانا احمد علی سیمابؔ کے صاحبزادے سید عبدالعلی کے مکان پر ہی قیام کیا تھا۔

حکیم سید سعید احمد بسملؔ سعیدی کے والد بزرگوار ہیں۔ یہ اسعدؔ تخلص کرتے تھے اور انھیں کی نسبت سے بسملؔ اور اُن کے تلامذہ اپنے نام کے ساتھ "سعیدی" لکھتے ہیں۔ اُن کی ولادت ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) کو ٹونک ہی میں ہوئی۔ وہ نہ صرف ایک حاذق طبیب تھے بلکہ اُردو، فارسی اور عربی کے عالم اور قادرالکلام شاعر بھی تھے اگرچہ وہ ٹونک اور اس کے نواح میں ایک باکمال طبیب ہی کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے۔ اُن کے شاگرد طب اور دینیات کے علاوہ فن شعر میں بھی کثیر تھے۔ تذکرہ "یادگارِ ضیغم" کا جو خطی نسخہ ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد میں موجود ہے اُس میں حکیم سعید احمد اسعدؔ کے متعدد تلامذہ کا حال ملتا ہے۔ اس میں دیو کی نندن ہنرؔ کو بھی اُن کا شاگرد بتایا گیا ہے۔

حکیم اسعدؔ کا کلام خاصی مقدار میں تھا مگر نہ وہ کبھی باقاعدہ جمع ہوا نہ کتابی صورت میں چھاپا گیا۔ متفرق کلام اہلِ ذوق کے سینوں میں محفوظ ہے۔ ان کا ایک مخمس جس میں حافظ شیرازی کی غزل کو تضمین کرتے ہوئے ہر شعر پر تین مصرعوں کا اضافہ کیا ہے اور ان میں ہندستان پر نادر شاہ دُرّانی کے حملے کی داستان نظم کر دی ہے اُن کے استادِ فن ہونے پر سب سے بڑا شاہد عادل ہے۔ یہ مخمس چند سال قبل رسالہ "آج کل" دہلی میں ایک مختصر تمہید کے ساتھ چھپا تھا۔

غالبؔ کے مشہور شعر:

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو ـــــ کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

پر اُنھوں نے پُرلطف تعریض کرتے ہوئے کچھ گرہیں لگائی ہیں یہ میں نے دو تین سال ہوئے "ہماری زبان" میں چھپوا دی تھیں۔ مذکورہ بالا دونوں تضمینیں ان کے اُردو اور فارسی مذاقِ سخن کا اچھا نمونہ ہیں اور اُن سے اُن کے معیارِ سخن کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ چند

متفرق اشعار یہاں درج کر رہا ہوں ۔

ملی ہے مجھ سے روحِ قیس اکثر دشتِ غربت میں
ادب سے ، ناقصِ فن جس طرح کامل سے ملتا ہے

○

شعر گوئی کے وہ اسباب کہاں ہیں اسعد
وقت بے وقت کو اک زد لگا رکھا ہے

○

اللہ اللہ کافری اُس بت کی جس کو دیکھ کر
مولوی سید سعید احمد برہمن ہو گیا

شعر آخر میں اُن کے زمانۂ "افتادِ دانی" کی ایک تلمیح ہے جس کے بیان کا یہاں موقع نہیں ہے ۔ خلاصہ یہ ہے کہ اِس شعر کو محض قافیہ پیمائی نہ سمجھا جائے ۔

مولوی سید احمد اسعد کا انتقال ۱۹۳۲ء میں ہوا ۔ "فنائے حلاوت" مادۂ تاریخِ وفات جناب سیماب اکبر آبادی نے برآمد کیا تھا ۔ ٹونک ہی میں اپنے آبائی قبرستان میں آسودہ ہیں ۔

انھوں نے دو عقد کیے ۔ پہلا عقد محمدی بیگم بنتِ مولوی سید زکریا ابن مولانا سید حیدر علی سے ہوا ، اُن کے بطن سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں ۔ دوسرا عقد صدیقہ بیگم بنت سید عاشق علی رام پوری سے ہوا ۔ اُن سے تین فرزند ہوئے ۔ حکیم سید یحییٰ میاں جو ماشاء اللہ ٹونک میں بقیدِ حیات ہیں اور اپنے آبائی مطب کو کامیابی سے چلا رہے ہیں ۔ دوسرے سید عیسیٰ میاں جو دنیائے شاعری میں بسمل سعیدی کے نام سے جانے جاتے ہیں اور تیسرے سید احمد علی جو پاکستان میں مقیم ہیں ۔

بسمل سعیدی نے اِس صدی کے آغاز میں آنکھیں کھولیں (۱۹۰۱ء) اور اپنے والد بزرگوار کی تعلیم و تربیت سے بہرہ مند ہوئے ۔ زندگی کا ابتدائی دور جس میں اثر پذیری کی صلاحیت بہت حساس ہوتی ہے ٹونک میں اور اپنی ننھیال ہونے کی وجہ سے رام پور میں گذارا ۔ اُس زمانے میں مومن اہلِ ٹونک کا پسندیدہ شاعر تھا اور غالب کی چنداں اہمیت نہیں تھی ۔ مومن کی نازک خیالی اور انتخاب الفاظ اور ماہرانہ دروبست کو استادی کی دلیل اور فن کا کمال سمجھا جاتا تھا ۔ اس کے بعد داغ اور ظہیر دہلوی کا کلام مقبول تھا ۔ دوسرے شعرا میں امراؤ مرزا انور دہلوی، مائل دہلوی، امیر مینائی، مضطر خیر آبادی، اور ریاض خیر آبادی کے نام آتے ہیں ۔ اس لیے ٹونک کے شعراء کے یہاں وہی نازک خیالی،

معنی آفرینی، الفاظ کی ماہرانہ بندش اور زبان کی صحت و نفاست کے ساتھ لب و لہجہ کی شائستہ شوخی ملتی ہے جو مذکورہ بالا شاعروں کے کلام کی ممتاز خصوصیات ہیں۔ غرض بسمل کی شاعری میں بھی مومن اور داغ کے اسلوب و ادا کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں اور ان اساتذہ کے سینکڑوں اشعار آج بھی بسمل کی نوکِ زبان پر ہیں۔

بسمل سعیدی کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کے دینی اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ اُس عہد کے ادبی ماحول کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہوگا۔ عقاید کے اعتبار سے اُن کے خاندان میں ولی اللّٰہی فکر کا اثر غالب رہا ہے جس نے ایک طرف تقلیدِ جامد کی مخالفت پوری سرگرمی سے کی تو دوسری طرف مختلف مدرسہ ہائے فکر میں تطبیق پیدا کرنے کا کام انجام دیا۔ اِس طرح اُن کے اجتہاد میں جارحیت پیدا نہیں ہوئی بلکہ تعمیری جذبہ غالب رہا۔ سیاسی طور پر اُن کے بزرگوں کو سیّد احمد شہید بریلوی کی تحریکِ جہاد سے براہِ راست سابقہ رہا بلکہ اس تحریک کو منظم کرنے اور اُسے ہندوستان گیر اہمیت عطا کرنے میں اس خاندان کا حصہ کسی سے کم نہیں رہا ہے حضرت سیّد شہید احمد بریلوی رح کی تحریکِ جہاد دراصل ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی تھی اور ۱۸۵۷ء کی شورش جسے "غدر" کا نام دیا گیا ہے اسی تحریک کی صدائے بازگشت تھی بسمل کے اجداد نے تحریکِ جہاد میں عملی حصہ لیا تھا اور اٹھارہ سو ستّاون کی تحریک میں بھی وہ محض تماشائی نہیں تھے۔ اُن کے پرنانا سیّد میرن جان بریلوی نے بھی "غدر" میں نمایاں حصہ لیا اور بعد کو اُنھیں کالے پانی بھیجنے کی سزا دی گئی جہاں سے وہ کسی طرح تین سال بعد رہا ہو کر آئے تھے۔ فکری آزادی اور جذبۂ جہاد اور اجتہاد پسندی کی یہ روایت بسمل کے ذہنی نشو و نما پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ انھوں نے شعر میں بھی وہی ولی اللّٰہی طرزِ فکر اختیار کیا ہے کہ ایک طرف دوسری روایات اور اصولوں کو باہم تطبیق دے کر گوارا بنایا جائے اور ان کے افادی پہلو کو نمایاں کیا جائے۔ دوسری طرف اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا جائے اور محض کورانہ تقلید سے دامن بچایا جائے۔ چنانچہ بسمل کی شاعری میں غزل کی صحت مند روایات کا احترام موجود ہے۔ وہ متروکات سے دامن بچائیں گے لفظ کی صحت اور محاورے کی درستی پر زور دیں گے بندش کی چستی اور صنایع لفظی و معنوی کے استعمال کو پسند کریں گے اور جتنی اہمیت شعر میں مفہوم کی ہے اُتنی ہی اُس کے الفاظ کو بھی دینا چاہیں گے۔ کبھی وہ مزاحاً کہا کرتے ہیں کہ بعض شعراء کے کلام میں ردیف تک یہ خبر

نہیں ہوتی کہ قافیہ کیا آئے گا۔ اس سے ان کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ شعر جن الفاظ پر تعمیر کیا جائے ان میں باہم معنوی رشتہ ہونا ضروری ہے۔

بسمل کے اشعار میں مناسبات لفظی کا اہتمام کثرت سے ملتا ہے۔ یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

تم سے آنسو بھی مرے اب نہیں پونچھے جاتے
جذب خورشید سے شبنم نہیں ہونے پاتی

مل گیا رنگ بھی تخلیق میں تیری ورنہ
صرف نکہت تو مجسّم نہیں ہونے پاتی

○

ہم اک عمر خضر ہر آن ضائع کر چکے لیکن
ہمیں ہر آن کو عمر خضر کرنا بھی آتا ہے

بچاتے ہیں نگاہیں خاک کے ذرّوں سے بھی لیکن
ہمیں افلاک پر نقد و نظر کرنا بھی آتا ہے

○

تمہاری جیسی شباہت کو ڈھونڈتا تھا دل
تمہاری شکل نہ دیکھی تھی جس زمانے میں

○

نظر جب حسن آتا ہے کسی منظر میں دنیا کے
اضافہ ہو کے رہ جاتا ہے وہ تیری محبت میں

○

گر تم متوجہ بھی ہوئے صورت خورشید
ہم تو صفت دیدۂ شبنم نہ ملیں گے

○

ہر صاحب نظر سے جدا ہے معاملہ
پردے پڑے ہوئے ہیں وہاں اعتبار کے

○

ان اشعار کا انتخاب بغیر کسی فکر و تامّل کے ہوا ہے۔ ان میں معنوی خوبی اور حسن ادا کے ساتھ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ تمام الفاظ ایک ہی معنوی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ بسمل کی شاعری کا خاص وصف ہے۔

بسمل نے اپنی شاعری کو اپنی ذات میں محصور کر لیا ہے۔ اسی لیے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے تجربات کی روداد ہے جیسا کہ اُنھوں نے خود کہا ہے۔

ہوگا تمھارا نام ہی عنوانِ ہر ورق　　اوراقِ زندگی کو الٹ دیں کہیں سے ہم

اور اسی لیے اُنھوں نے اپنے مجموعۂ کلام کو بھی "اوراقِ زندگی" ہی کہا ہے۔ ان کی غزل میں روایات کا پورا احترام موجود ہے اور کوئی قابلِ ذکر انحراف نہیں ہے لیکن ان کے ہم عصروں میں شاید اور کسی نے اتنی کثرت سے اور اتنی کامیابی کے ساتھ مسلسل غزلیں نہیں لکھی ہوں گی۔ حقیقی بسمل سعیدی کے مجموعۂ کلام "مشاہدات" اور "اوراق زندگی" کے صفحات پر مل جائیں گی۔ اس خصوصیت میں وہ سوداؔ کی یاد دلاتے ہیں۔ انھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن ان میں ہیئت کے تجربات نہیں کیے۔ ان کی نظم میں بھی غزلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ البتہ غزل کو "بیانیہ" بنا دینا اُن کی اپنی خصوصیت ہے۔

سوداؔ کی یاد وہ ایک اور صنف میں بھی دلاتے ہیں۔ یعنی ہجویہ شاعری میں۔ انھوں نے مدحیہ اشعار بھی لکھے ہیں۔ کچھ واقعی عقیدت سے اور کچھ حالات کے دباؤ یا معاشی تنگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے۔ مگر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جو شاعر مدح طرازی میں رطب اللسان ہو وہ ہجو سے اپنا دامن آلودہ نہ کرے۔ کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا ——— بسمل نے زاہدانِ ریائی کی خبر بھی لی ہے۔ متشاعروں کو بھی نہیں بخشا ہے اور بعض قوم فروشوں کی مزاج پرسی بھی کی ہے لیکن ایک تو ایسی ہجویات کو وہ شائع نہیں کراتے۔ دوسرے ان میں کسی کا نام شامل نہیں ہوتا۔ قرائن سے اُس کی شخصیت کو متعین کرتے ہیں۔ چور کی ڈاڑھی میں تنکا تو ہوتا ہی ہے لہٰذا بقول منشی سجّاد حسین (ایڈیٹر اودھ پنچ) جس کے سر پر یہ ٹوپی فٹ ہو جائے فَہُوَ الْمَغْلُول ——— ان ہجویات میں کسی طرح کے رکیک الفاظ یا خلافِ تہذیب کنائے بھی نہیں ملیں گے جن سے ادبی وزن و وقار کم ہوتا ہو۔ ان کی بعض ہجویات کے مسوّدے میرے پاس محفوظ ہیں اور میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ عصرِ حاضر میں اُردو شاعری کی اِس صنف کو پورے ادبی آب و رنگ کے ساتھ بسمل کے سوا کسی نے زندہ نہیں رکھا۔

اب رہا بسمل کے سماجی اور اخلاقی تصوّرات کا پہلو۔ آج دنیا بہت بدل گئی ہے تصوّرات بھی بدل چکے ہیں۔ خوب و زشت کی اضافتیں تبدیل ہو گئی ہیں۔ اب نہ وہ معاشرہ ہے

جس میں اخلاق چاہے کتنا بھی خوار و زبوں رہا ہو مگر اخلاقی تصوّرات بوسیدہ نہیں ہوئے تھے۔ اُس سماج کے لوگ معصیت، فسق و فجور، اخلاقی بے عنوانیاں اور جرائم سب کچھ کرتے تھے مگر انھیں معصیت، اور جرائم ہی سمجھ کر کرتے تھے انھیں خوبصورت نام دے کر نہیں۔ آج خیر و شر کی تعریف کرنا بھی دُشوار ہے اور کسی مجرم کو کسی اعلیٰ تصوّر کی دہائی دینا بھی مشکل ہے۔ بسمل ابھی تک ان قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور ان کا ایمان متزلزل نہیں ہوا ہے۔ وہ آج بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اعلیٰ اخلاقی قدروں پر پختہ ایمان ہی معاشرے کے استحکام کی ضمانت دے سکتا ہے۔ عہدِ جدید کے پراگندہ تصوّرات میں ان کی نحیف و نزار آواز کسی کو بے وقت کی راگنی معلوم ہوا کرے مگر خود بسمل نے اس آواز کو جھکنے نہیں دیا ہے۔

بسمل نے اپنی شاعری کا خام مواد اپنی شخصیت کی تہوں کھود کر نکالا ہے۔ وہ خارجی موضوعات کو بھی ہضم کر کے اپنے احساسات کا جزو بنا لیتے ہیں اور پھر اسے شعر کے سانچے میں ڈھالتے ہیں اس لیے احساس کی شدت ان کی شاعری کا دوسرا بڑا اور بنیادی وصف ہے۔ یوں تو ہر شاعر فطری طور پر عام انسانوں سے زیادہ حسّاس ہوتا ہے مگر بسمل کے احساسات کو اُن کے ذاتی حالات نے اور بھی کٹیلا بنا دیا ہے۔

اس وقت ہمیں شاعری کے جدید تر تصوّرات سے بحث نہیں لیکن وہ غزل جو ایک روایت کی شکل میں ولی دکنی سے عہدِ بہ عہد ترقی کرتی ہوئی فراق اور روش تک آئی ہے اُس غزل کے میدان میں اب سناٹا ہو چکا ہے۔ فراق اپنی عمر کے آخری دَور میں ہیں۔ اُن کے بعد چاروں طرف نظر ڈالیے تو آپ کو کتنے غزل گو ملیں گے؟ --- وہ خواہ دو ہوں یا دس اُن میں ایک بسمل سعیدی ضرور ہیں۔ اُن سے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے:

اے شمعِ صبحِ محفل اِن کو جلا کے بجھنا
دو چار اور تیرے پروانے رہ گئے ہیں

میکش اکبرآبادی

خوش خو انسان، خوش گو شاعر

بسمل صاحب کے متعلق یہ چند سطریں حاضر کر رہا ہوں ۔ درمیان میں دراز سر
بیاد ہو گیا تھا تو میں نے ایک معذرت نامہ لکھوا کر حاضر کر دیا تھا۔ بہرحال
شرمندہ ہوں اور جو کچھ اس حالت میں بن پڑا حاضر کر رہا ہوں ۔ دل نہ مانا کہ آپ
کے ارشاد کی تعمیل نہ کروں ۔

۱۹۳۵ء کی بات ہے کہ جے پور میں ایک نیم سرکاری مشاعرہ ہوا غیر منقسم ہندوستان کے تمام معروف و نمایاں شاعر اس میں شریک ہوئے مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب جہاں تک عرض نہیں کر سکتے تھے اس لیے انھوں نے سلام کہہ کر بھیجا تھا ماہر القادری صاحب یہ سلام لے کر حیدرآباد سے آئے تھے فانی اور یگانہ بھی حیدرآباد ہی سے آئے تھے ۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حضرت امجد حیدرآبادی پیرانہ سالی کے باوجود اس مشاعرے میں شریک ہوئے تھے ۔ سب سے پہلے اس مشاعرے میں میں نے بسمل سعیدی صاحب کی زیارت کی تھی جگر مرادآبادی ایڈورڈ میموریل میں ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے ان کے گرد شاعروں کا ایک حلقہ تھا مگر ان کے مخاطب ایک ہی صاحب تھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بسمل سعیدی ہیں ۔ اور فانی صاحب یگانہ صاحب کے کمرے سے ملول اور رنجیدہ واپس آ رہے تھے جگر صاحب فانی صاحب کو دیکھتے ہی اس حلقے سے اٹھ آئے اور انھوں نے ہی بسمل صاحب کا غائبانہ تعارف بہت اچھے الفاظ میں ہم لوگوں سے کرایا اور ان کی شاعری کے ساتھ ہی ان کی شرافتِ نفس اور شرافتِ نسبی کا ذکر بھی کیا ۔ اس کے بعد بسمل صاحب سے بارہا نیاز حاصل ہوا اور ہمیشہ میں ان کی شخصیت اور ان کی شاعری سے متاثر ہوتا رہا ۔

بسمل صاحب ایک شائستہ رند اور نہایت مہذب قلندر ہیں ۔ فنِ شاعری، اندازِ بیان

اور الفاظ پر انھیں پوری طرح قابو ہے واردات وکیفیات کو وہ جس حسن کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں وہ جب تک شاعر اہلِ دل، اہلِ فن اور زمانے کے گرم و سرد چشیدہ نہ ہو اور زبان و بیان پر قدرت نہ ہو بیان نہیں کی جا سکتیں۔ ان کا مزاج ان کے سارے کلام پر چھایا ہوا ہے ان کے کلام میں ان کے دل کی چوٹیں جگہ جگہ ابھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کے علم و دانش کے مظاہر اور ان کی قوتِ بیان ہر لفظ سے نمایاں ہیں۔ لیکن جو چیز مجھے سب سے نمایاں اور بلند نظر آتی ہے وہ ان کے وہ اشعار ہیں جہاں ان کا ذوقِ جمال اور مشربِ عشق کارفرما ہے۔

ایک زمانے میں ٹونک اپنے نوابین کی قدردانی اور مذاقِ شعری کی خصوصیات کی وجہ سے ایک اسکول کی حیثیت رکھتا تھا۔ جامؔ صاحب جو نواب صاحب کے استاد تھے مولانا عاشق صاحب اور مولانا صولت صاحب، مولانا شرف الدین یاس وغیرہ کتنے ہی بزرگوں کی میں نے زیارت کی ہے اور ان کی زبان سے ان کا کلام سنا ہے۔ زبان و بیان کی صفائی اور فن کا رکھ رکھاؤ وہاں کی عام فضا پر طاری تھا اور اس فضا کا بہترین نمونہ بسملؔ صاحب کا کلام ہے۔

بڑی مسرت ہے کہ بسملؔ صاحب کی بے نیازی کا خلا ان کے قدردانوں نے پُر کر دیا اور بسملؔ صاحب کی ستھری اور نکھری ہوئی شاعری کی طرح حسین کتابت و طباعت سے مزین ان کا کلام ہم تک پہنچ گیا۔ ارادہ یہ تھا کہ اس موقع پر بسملؔ صاحب کے اشعار پیش نہ کروں لیکن اپنے ذوق سے مجبور ہو کر اپنی پسند کے بہت سے شعروں میں سے چند شعر پیش کر رہا ہوں۔

کیا چیز ہے بندگی کہ اکثر ــــ طاعت بھی گناہ ہو گئی ہے

واقف نہ تھا میں ترکِ تعلق سے ہم نشیں ــــ ہوتی ہے ابتدائے محبت یہاں سے کیا

کیا ترکِ آرزو بھی نہیں ہے قبولِ حسن ــــ اٹھتے ہیں پاؤں دھر اب ارادہ کیے بغیر

ناکام اٹھنے والے بھی اس بزمِ ناز سے ــــ اٹھتے ہیں اک امید کی دنیا لیے ہوئے

جو ہوئی تھیں وجہِ ترکِ رسم و راہ ــــ اُن جفاؤں کو بھی اب روتے ہیں ہم

تم نہ ہوتے اگر زمانے میں ــــ کس سے اٹھتا ستم زمانے کا

ان کے دواوین کا کوئی صفحہ ایسا نہیں ہے جہاں ایسے کتنے ہی گوہرِ آبدار رکھے ہوئے نہ ہوں۔ خدا کرے ابھی بسملؔ صاحب بہت روز تک ایسے ہی جواہر بکھیرتے رہیں اور ہمیں مستفید کرتے رہیں۔

ساحر ہوشیارپوری

سیّد عیسیٰ میاں بسمل

نام کا کردار سے کچھ تعلق ضرور ہوتا ہے، یہ بات کم از کم عیسیٰ میاں کے متعلق بہت حد تک درست ہے۔ حضرت عیسیٰ مصلوب کیے گئے تھے۔ سید عیسیٰ میاں کے اردگرد صلیبیں ہی صلیبیں بکھری ہوئی ہیں۔ ہر روز چند صلیبیں ان پر حملہ کرتی ہیں اور دل و دماغ پر زخموں کے نشان چھوڑ جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنے نام کی رعایت سے قدرت کی ستم ظریفی کو ٹالنا چاہا تو تخلص نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ عیسیٰ میاں شعر کہنے لگے تو بسمل تخلص اختیار کر لیا۔ اور پے بہ پے زخم کھا کھا کر زندہ شہید کے رتبے کو پہنچ گئے۔

اب یاد نہیں آتا کہ بسمل سعیدی صاحب سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی لیکن خیال ہے کہ پچیس برس پیشتر وہ دلی تشریف لائے تھے، تو جوش ملیح آبادی کے دفتر میں ان سے تعارف ہوا تھا۔ اسی شام کو رندانِ خوش اوقات کی ایک مخصوص محفلِ بادہ و جام میں ان کی رفاقت کا بھی لطف حاصل ہوا تھا۔ لمبا قد، چھریرا بدن، علی گڑھ کٹ پاجامہ اور بادامی شیروانی میں ملبوس بسمل صاحب کی روشن روشن آنکھوں سے ذہانت کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ بات کرتے تو بڑے نپے تلے انداز میں، اور اس قدر مختصر اور جامع کہ جیسے قارون کی طرح الفاظ کے خزانے پر سانپ بن کر براجمان ہوں، مبادا الفاظ کی دولت ضائع ہو جائے۔ آدابِ محفل کی اس قدر پابندی اور لحاظ کہ نفاست اور شائستگی بھی پناہ مانگیں۔ کیا مجال جو ماحول کے اثرات کی ہلکی سی جھلک بھی چہرے سے عیاں ہو جائے۔ کسی نے لطیفہ سنایا اور محفل قہقہہ زار بن گئی لیکن بسمل صاحب بس ذرا سا مسکرا دیے۔ ایسی مسکراہٹ جو سنائی نہ دے، صرف دکھائی دے۔ دوسرے پیگ پر شعر خوانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بسمل صاحب اسی طرح متین اور سنجیدہ بیٹھے رہے۔ کوئی شعر پسند آگیا تو ہلکی سی آواز میں داد بھی

دی اور مکرر تر کی فرمائش کر دی تیسرے پیگ پر البتہ کچھ چہکنے لگے۔ اچھے شعر پر بھرپور داد دینے لگے، لطیفوں پر ہلکا سا قہقہہ بھی سننے میں آیا۔ اور جب اُن سے فرمائش کی گئی تو نہایت باوقار انداز اور منجھے ہوئے تحت میں ایک ایسی غزل سُنائی جو ہر پہلو سے مطلع سے مقطع تک مرصع کاری کا بے مثل نمونہ تھی۔ اور سوز و گداز کی نرم و نازک کیفیات کے ساتھ ساتھ محبت کے ارفع، اعلیٰ اور لطیف جذبات کی ترجمانی کرتی تھی۔ مجھے اس وقت واقعی یہ محسوس ہوا کہ میری ملاقات غزل کے خالق بسمل سعیدی سے نہیں، بلکہ "محبت کے پیمبر" سے ہوئی ہے۔ اس غزل کے یہ شعر آج تک نہاں خانۂ دل میں محفوظ ہیں:

بہت ہوتی ہے یوں تو عشق کی توقیر دنیا میں
مگر اتنی نہیں جتنی تری محفل میں ہوتی ہے

محبت اے معاذ اللہ محبت دم نکل جائے
اگر محسوس بھی آتی ہو جتنی دل میں ہوتی ہے

ٹھہرنے بھی نہیں دیتی ہے اس محفل میں بیتابی
مگر تسکین بھی جا کر اسی محفل میں ہوتی ہے

پرستش کر، محبت کرنے والوں کی پرستش کر
خدا ہوتا ہے دل میں جب محبت دل میں ہوتی ہے

غالباً چھٹے پیگ کے بعد محفل برخاست ہوئی تو بسمل صاحب کے متعلق میں یہ تاثر لے کر اٹھا کہ "اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں" اور میرا یہ خیال درست ہی ثابت ہوا۔

اُن دنوں بسمل صاحب آزاد ہند ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ شام کو اکثر وہیں محفل جمتی تھی۔ اور دن میں جوش ملیح آبادی اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (آئی۔ اے۔ ایس) کے دفتر میں اُن سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ مقامی نیز بیرون جات کے مشاعروں میں بھی رفاقت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ دو اڑھائی سو میل تک کے مشاعروں میں شریک ہونے کے لیے کنور صاحب نے ایک نرالا انداز وضع کر لیا تھا۔ شام کو ان کی کوٹھی پر "یاران طریقت" جمع ہو جاتے تھے۔ اور وہاں سے یہ قافلہ موٹر کاروں میں روانہ ہو کر رات کے نو بجے تک مشاعرہ گاہ میں پہنچ جاتا تھا۔ صبح کے دو تین بجے مشاعرہ ختم ہوا اور یہ قافلہ دلی کے لیے واپس روانہ ہوا۔ مراد آباد، علی گڑھ، میرٹھ، انبالہ، کرنال، شکوہ آباد وغیرہ کے مشاعروں میں شرکت کرنے کا یہ انداز کئی برس تک جاری رہا۔ یاران طریقت کا یہ گروہ جوش ملیح آبادی، پنڈت ہری چند اختر، بسمل سعیدی، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، نریش کمار شاد، بسمل شاہجہانپوری اور خاکسار پر مشتمل ہوتا تھا۔ جوش ملیح آبادی کے برادر عزیز رئیس احمد خاں بھی اکثر و بیشتر ہوتے تھے۔ وہ شاعر تو نہیں تھے لیکن شعر فہم ضرور تھے اور ایک ماہر موسیقار بھی۔ دوران سفر

میں شغلِ مے و مینا کے ساتھ ساتھ شعر خوانی، ادبی مباحث، لطیفہ گوئی اور خوش گپیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہتا تھا۔ رئیس احمد خاں کے دادرے اور ٹھمریاں ماحول کو رنگین تر بنا دیتی تھیں۔ ان بے تکلفانہ صحبتوں کے باعث مجھے بسمل صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ ان کی زندگی ایک ایسا المیہ ہے جس کے بنیادی عناصر تو رنج، ناامیدی، حزن، یاس اور افسردگی ہیں۔ لیکن کبھی کبھار یہی عناصر خوشی کا لبادہ اوڑھنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں تو ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی نمودار ہو جاتی ہے، جسے زہر خند سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں کو بسمل صاحب کی زندگی کا مشاہدہ کرنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی وہ اس المیے کی ایک جھلک اُن کے شعروں میں محسوس کر سکتے ہیں۔ مثلاً:

وائے انجامِ عشرتِ ہستی ____ دل لرزتا ہے شادمانی سے
اے غمِ عشق چھین لی تو نے ____ زندگی میری زندگانی سے
قیامت ہے وہ غم جس غم سے یاد آئے خوشی اپنی ____ نظر آتی ہے اپنے آنسوؤں میں اب ہنسی اپنی
جس قدر تو نے رُلایا ہے زمانے مجھ کو ____ اب کسی اور کو اتنا تو ہنسانا بھی نہیں
کچھ ایسے لوگ محرومِ خوشی دیکھے ہیں دنیا میں ____ کہ اپنے حق میں غم کر لی ہے اپنی ہر خوشی میں نے
میری آنکھوں سے تم اب اپنی امانت لے لو ____ بد نصیبوں کے کوئی پونچھ نہ ڈالے آنسو
عشق کا غم، وہ بھی تیرے عشق کا ____ کون کر سکتا مری غم خواریاں
رسم و رواجِ دہر میں کیا یہ بُری کمی نہیں ____ ماتمِ مرگ ہے مگر ماتمِ زندگی نہیں

بسمل صاحب کی زندگی کا ہر لمحہ غم سے کیوں عبارت ہے، اس کی وجہ معلوم کر لینا کوئی آسان بات نہیں۔ وہ اپنی زبان سے تو اس کا اظہار کرتے ہی نہیں۔ بس ایک لمبی آہ کھینچ لی اور بڑے کرب سے "اُفوہ" کہہ دیا۔ لیکن ان کے مزاج کو سمجھنے اور جاننے والا یہ جان لیتا ہے کہ اس "افوہ" کے دامن سے کتنے غم، کتنی حسرتیں اور کتنی ناکام آرزوئیں لپٹی ہوئی ہیں۔

عام قاعدے کے مطابق کسی خواہش کے پورا نہ ہونے سے انسان مبتلائے غم ہو جاتا ہے لیکن یہ ایسا غم نہیں ہوتا جو دائمی ہو کر رہ جائے۔ بسمل صاحب کی ٹریجڈی کچھ اور ہی قسم کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محرومی، افسردگی، اور ناکامی کا احساس اُن کی طبیعت کا ایک جزوِ خاص بن چکا ہے۔ اور دونوں جہاں کی نعمتیں بھی ان کو میسّر آ جائیں تو پھر بھی وہ کسی

نہ کسی شے کی کمی محسوس کر کے افسردہ وملول رہیں گے۔ ایک بار انھوں نے ایک ایسی خواہش اپنے اوپر طاری کر لی کہ جس کا پورا ہونا بظاہر ناممکن تھا۔ وہ ایک ایسے کافر ادا پر مر مٹے جو اس مصرعے کا مصداق تھا:

نہ بہ زاری نہ بہ زوری نہ بہ زری آید

بسمل صاحب دن رات اُسی کے تصور میں رہنے لگے۔ اور غزلوں پہ غزلیں کہی جانے لگیں۔ "اوراقِ زندگی" (چوتھا مجموعۂ کلام) میں مسلسل غزلوں کے عنوان سے جو گوشہ شامل ہے اس کی اکثر غزلیں اسی دَور کی یادگار ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار دیکھیے:

خدا کرے مجھے دم بھر کو بھی نصیب نہ ہو
وہ زندگی جسے تیری خوشی نصیب نہ ہو

ترے لیے ہی نہ ہو زندگی و موت اگر
تو زندگی ہی نہیں موت بھی نصیب نہ ہو

اگر پیا ہو کسی چشم مست کا ساغر
تری نظر سے مجھے مے کشی نصیب نہ ہو

سکوں نصیب ہوا ہو کبھی جو تیرے بغیر
خدا کرے کہ مجھے تو کبھی نصیب نہ ہو

خدا سے تیرے سوا اور کچھ اگر مانگوں
خدا کرے کہ مجھے بھیک بھی نصیب نہ ہو

اگر ہوا ہوں میں آلودۂ شباب کہیں
ترے جمال کی پاکیزگی نصیب نہ ہو

اور جب خدا نے بسمل صاحب کی یہ آرزو بھی پوری کر دی اور محبوبِ تغافل کیش نے ان کو التفاتِ فراواں سے نوازا تو اس کی چشم مست کے ساغر سے مے کشی کر کے اور اس کے جمال کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہو کر بسمل صاحب پر شادی مرگ کا جذبہ طاری ہو گیا اور وہ ایک مختصر سی تحریر اپنے کمرے کی میز پر چھوڑ کر خودکشی کے ارادے سے جانبِ جمنا روانہ ہو گئے۔ اسے امر اتفاق ہی کہیے کہ ان کی یہ تحریر ایک ایسے دوست کے ہاتھ لگ گئی جو ان کے رازدار بھی تھے اور بہی خواہ بھی۔ — جب وہ اُن کی تلاش میں جمنا کے ساحل پر پہنچے تو بسمل صاحب اور جمنا کی لہروں میں کچھ زیادہ فاصلہ باقی نہ تھا۔ چنانچہ انھیں سمجھا بجھا کر واپس لایا گیا۔

بسمل صاحب کی کتابِ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ غم و رنج سے ان کی دائمی وابستگی اوڑھی ہوئی چیز نہیں۔ یہ کوئی واہمہ نہیں ہے جسے انھوں نے خود پر مسلط کر لیا ہو۔ یہ ردِ عمل ہے ان ناخوشگوار واقعات و معاملات کا جو روزمرہ کی زندگی میں ان پر گزرتے رہتے ہیں۔ وہ ایک وفا آشنا مزاج رکھتے ہیں۔

دوستی اور محبت میں ہر قسم کی قربانی اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ جس کو چاہتے ہیں، خلوصِ دل سے چاہتے ہیں۔ اور اپنے دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں سے اسی طرح کے ایثار، خلوص اور سلوک کی توقع رکھتے ہیں۔ لیکن جب یہ توقع مایوسی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور احباب کا رویہ اُن کے قائم کردہ معیار اور کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تو ان کے ذہن پر ایک چوٹ لگتی ہے، دل مجروح ہو جاتا ہے۔ اور وہ شدتِ احساس سے مغلوب ہو کر ناامیدی، غم، افسردگی اور حزن و یاس کے عمیق اور اتھاہ سمندر میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ اور وفا و محبت کے نغموں کا خالق اس قسم کے اشعار کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے :۔

غیر ممکن بھی ہے ممکن مجھے معلوم نہ تھا
ایک دن آئے گا یہ دن مجھے معلوم نہ تھا

اور کچھ میں ترے ظاہر سے سمجھتا تھا تجھے
اور کچھ ہے ترا باطن مجھے معلوم نہ تھا

آہ، ہو سکتی ہے بیداد پہ مائل وہ نظر
ہو جو الطاف کی ضامن مجھے معلوم نہ تھا

دشمنی کے لیے مخصوص ہے جو طرزِ عمل
دوستی میں بھی ہے ممکن مجھے معلوم نہ تھا

مجھے ایسے متعدد واقعات کا ذاتی علم ہے جن کے ناخوش گوار اثرات نے ان کی رُوح کو چھلنی کر کے رکھ دیا ہے۔ شدتِ احساس کے ان زخموں کا کوئی علاج نہیں، کوئی مرہم نہیں۔ یہ ایسے ناسور ہیں جو ایک ذی حس اور زود حس انسان کو ہمہ وقت غم و الم ہی کے تانے بانے میں مبتلا رہنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بسمل صاحب کے طفیل بہت سے مبتدی آج کل کے مشہور شاعر بنے ہوئے ہیں، لیکن حقِ خدمت ادا کرنا تو کجا، یہ تک ماننے کو تیار نہیں کہ وہ کبھی بسمل صاحب سے اپنے کلام پر مشورہ بھی لیا کرتے تھے۔ کلام کے مجموعے اور دیوان چھپ گئے لیکن بسمل صاحب کے لیے شکریے تک کا لفظ اُن میں شامل نہیں۔ نجی زندگی میں اپنے ہم وطنوں، دوستوں اور عزیز و اقربا سے جو زخم ان کو پیہم ملے ہیں اور مل رہے ہیں ان کی ایک طویل فہرست ہے جس کا بیان خلافِ مصلحت بھی ہے اور سماجی قدروں کے منافی بھی۔ یہ زخم دکھائے نہیں جا سکتے۔ یہ زخم ایسی صلیبیں ہیں جو ہر کسی کو نظر نہیں آتیں اور عیسیٰ میاں ان صلیبوں کو اٹھائے زندگی کی راہ پر بڑی مستقل مزاجی سے گام زن ہیں۔ میرے نزدیک بسمل سعیدی، عیسیٰ میاں اور زندہ شہید ایک ہی انسان کے تین نام ہیں۔

مخمور سعیدی

بلّا جی

بسمل صاحب کا نام بہت بچپن سے سن رکھا تھا لیکن انھیں پہلی بار میں نے ۱۹۵۰ء میں دیکھا جب وہ دلی میں کچھ مدت مقیم رہ کر واپس ٹونک پہنچے تھے۔ بسمل صاحب کے ایک پرانے دوست ہیں ارشاد محمد خاں، بازار قافلہ میں اُن کی دکان بسمل صاحب کی نشست گاہ تھی۔ اگر کوئی مصروفیت نہ ہو تو شام کا دھندلکا پھیلتے ہی بسمل صاحب وہاں آ جاتے تھے اور دکان بند ہونے تک وہیں رہتے تھے۔ ان کی وجہ سے کچھ اور لوگ بھی چلے آتے، خاص طور پر صولت صاحب مرحوم اور منشی عتیق اللہ خاں مرحوم، یہ دونوں مرحومین بھی بسمل صاحب کے پرانے دوستوں میں تھے۔ ارشاد محمد خاں دکان بند کرتے تو یہ لوگ کرسیاں چھوڑ کر یا تو دکان کے تختوں پر ہی براجمان ہو جاتے یا پھر کسی چائے خانے کا رخ کرتے اور رات کے گیارہ بارہ بجے تک محفل جمی رہتی۔

یہ میری شاعری کے آغاز کا زمانہ تھا۔ بسمل صاحب کی کشش مجھے بھی ان محفلوں میں کھینچنے لگی۔ بسمل صاحب دیکھنے میں کمزور نظر آتے تھے لیکن ان دنوں افسردہ دلی ان پر غالب نہیں آئی تھی۔ لمبا قد، کشادہ پیشانی، کچھ سوچتی ہوئی سی روشن آنکھیں اور موٹی موٹی ترشیدہ مونچھوں کے سائے میں پتلے پتلے متبسم ہونٹ۔ وہ بڑی خوشدلی کے ساتھ گفتگو کرتے۔ موضوع گفتگو بالعموم شاعری ہوتی۔ بسمل صاحب کے پاس بہت سے رسائل آتے تھے اور کبھی کبھار کتابیں بھی جو انھیں لوگ تحفتہً بھیجتے تھے۔ جب کوئی نیا رسالہ یا کتاب آتی، بسمل صاحب گھر سے چلتے ہوئے اسے ساتھ لے آتے اس شام کی گفتگو کا موضوع وہ رسالہ یا کتاب ہی ٹھہرتی۔ رسالہ ہو یا کتاب اس پر جگہ جگہ بسمل صاحب کے قلم کے نشان لگے ہوتے جو بسمل صاحب کی پسند یا ناپسند کو ظاہر کرتے۔ پسندیدگی کے اظہار کے لیے بسمل صاحب صرف نشان لگا دینا کافی سمجھتے تھے لیکن ناپسندیدگی کا اظہار وہ لفظوں میں کرتے۔ اکثر بہت ہی دلچسپ فقرے ان کے قلم سے نکلتے جو نہ

صرف متعلقہ تحریر کو آئینہ دکھاتے بلکہ مصنف کا چہرہ بھی اُن میں صاف نظر آجاتا۔

میں ان دنوں جو کچھ کہتا تھا والد مرحوم نازش صاحب کو دکھاتا یا کبھی کبھی صاحبزادہ مصطفٰے خاں جوہر سے، جن کی جواں مرگی کے تصور سے کلیجہ منہ کو آتا ہے، مشورہ کرلیا کرتا تھا۔ جوہر صاحب سے تعلقات کی نوعیت دوستانہ تھی لیکن وہ عمر میں مجھ سے بڑے تھے اس لیے میں ان کا ادب بھی کرتا تھا۔ ان کے اور والد مرحوم نازش صاحب کے ایما پر میں نے فیصلہ کیا کہ میں بسمل صاحب کی شاگردی قبول کرلوں۔ میں نے بسمل صاحب سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو انھیں تھوڑا سا تامل ہوا لیکن جب میں نے کہا کہ اس میں نازش صاحب کا ایما بھی شامل ہے تو وہ مان گئے۔ پہلی غزل جو میں نے انھیں دکھائی اس کا ایک شعر تھا :

دل ہے اور ایک نزہتِ احساسِ بے پناہ
میں ہوں اور ایک لذتِ بے نام آجکل

بسمل صاحب نے بعض اشعار پر ۰۲۰ کا نشان بنایا، دو تین شعروں کے بارے میں کہا کہ کمزور ہیں قلمزد کردو، اصلاح صرف اسی شعر پر دی اور "بے پناہ" کو "بے قیاس" بنادیا۔ ایک لفظ کی تبدیلی سے شعر میں جو حسن پیدا ہوگیا، اسے بیان کی ضرورت نہیں۔

بسمل صاحب سے اپنے کلام پر اصلاح لینے کے مواقع مجھے کم ہی حاصل ہوئے لیکن ان کی خدمت میں حاضر رہنے اور شعر و ادب پر ان کے خیالات سننے کے موقعے مجھے بہت ملے ہیں۔ وہ اپنی ذات سے ایک دبستان ہیں۔ ان کے ساتھ رہنا، ان کی گفتگو سننا، شعر سناتے ہوئے یا سنتے ہوئے، ان کے چہرے کے تاثرات کو سمجھنا، گویا شاعری کے رموز و نکات کا درس لینا ہے۔ فارسی اور اُردو کے اساتذہ کے سینکڑوں منتخب شعر ان کی نوکِ زبان پر ہیں۔ ایک ہی نشست میں وہ بیسیوں شعر سنادیں گے، ان کے محاسن پر روشنی ڈالیں گے، ان شاعروں کے اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان کی خصوصیات گنائیں گے جن کے یہ اشعار ہیں، قریب المعنی اشعار کا موازنہ کریں گے، کسی ایک شعر کو دوسرے پر ترجیح دیں گے تو یہ بھی بتائیں گے کہ وجہِ ترجیح کیا ہے۔ اچھے شعر کی کسوٹی ان کے نزدیک سنجیدگیِ خیال اور بیان کی تازگی ہے۔ کوئی شعر کسی رکیک خیال کا حامل ہے تو محض پیرایۂ بیان کی عمدگی بسمل صاحب کو متاثر نہیں کرے گی، اگر معاملہ برعکس ہے، تب بھی بسمل صاحب تکدر ہی محسوس کریں گے۔

بسمل صاحب لفظوں کے استعمال میں بہت محتاط رہتے ہیں، اپنی گفتگو میں بھی اور شاعری

میں بھی؛ اور جب وہ اپنے عالم میں ہوں تو ان کی گفتگو بھی شاعری ہی ہوا کرتی ہے۔ میں نے انھیں اکثر کہتے سنا ہے کہ لفظ و معنی کا رشتہ لباس اور جسم کا نہیں، جسم اور جان کا رشتہ ہے جو بہت نازک ہوتا ہے۔ لباس کی تبدیلی جسم کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی لیکن جسم کی تبدیلی اس اکائی کو فنا کر دے گی جو جسم اور جان کا مرکب ہے۔ لفظ و معنی کی یہ وحدت بسمل صاحب کی شاعری کا ایک نمایاں وصف ہے۔

بسمل صاحب کا کہنا ہے کہ انسانوں کی طرح لفظ بھی اپنا مزاج رکھتے ہیں اور ان کے مزاج کا احترام اس شخص پر واجب ہے جو اُن سے کوئی کام لینا چاہتا ہے۔ شاعر کا وسیلۂ اظہار لفظ ہی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ ان کا مزاج شناس ہو اور یہ جانتا ہو کہ کس موقعے پر کن الفاظ سے کام لیا جانا چاہیے ورنہ کسی ایک لفظ کا بے محل استعمال پورے شعر یا پوری نظم کے تاثر کو مجروح کر سکتا ہے۔

بسمل صاحب ٹونک میں چند ہی مہینے رہے۔ ٹونک سے انھیں نواب مکرم علی خاں نے جو اُن کے پرانے قدرداں تھے انھیں جے پور بلا لیا۔ جے پور میں بھی بسمل صاحب زیادہ دن نہیں رکے اور دوبارہ دلّی چلے آئے۔ فروری ۱۹۵۳ء کی ابتدائی تاریخوں میں جب میں دلّی پہنچا تو بسمل صاحب دلّی ہی میں تھے اور ان کا قیام آزاد ہند ہوٹل میں تھا۔ آزاد ہند ہوٹل کے قریب ہی اردو بازار میں ہفتہ وار "ماحول" کا دفتر تھا جس کے مالک اور مدیر ظفر ادیب تھے۔ بسمل صاحب کے کہنے پر ظفر ادیب صاحب نے اپنے دفتر کے ایک حصّے میں مجھے تھوڑی سی جگہ دے دی اور میں وہاں رہنے لگا۔ شام کو ہر روز بسمل صاحب سے ملنا ہوتا۔ کبھی کتب خانۂ عزیزیہ پر جو اُن دنوں دلّی کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کی شام کی نشست گاہ تھا۔ اور کبھی آزاد ہند ہوٹل میں، جہاں مرحوم سلام مچھلی شہری بھی مقیم تھے۔ شام کو اکثر ادھر آ نکلنے والے شاعروں میں جوش ملیح آبادی، ساحر ہوشیارپوری، جگن ناتھ آزاد، پنڈت ہری چند اختر اور عرش ملسیانی شامل تھے۔ افضل پشاوری ہوٹل کے مالک تھے وہ بھی موجود ہوتے۔ ان حضرات کی محفل میں مجھے بھی شرکت کے موقعے ملتے رہتے لیکن جس شام جوش صاحب آتے میں ٹل جاتا۔ جوش صاحب میری ایک نظم کی بنا پر مجھ سے ناخوش تھے جو "الحمرا" لاہور کے ایڈیٹر حامد علی خاں نے ایک تعریفی نوٹ کے ساتھ اپنے پرچے میں شائع کر دی تھی۔ نظم کا عنوان "جنون و خرد" تھا۔ یہ بیانیہ انداز کی نظم تھی جس میں 'خرد' کے مقابلے میں 'جنوں' کے برتر قدر

ہونے پر زور دیا گیا تھا۔ اس سے پہلے جوشؔ صاحب کی ایک نظم بھی اسی عنوان سے دلی کے ہفت روزہ "ریاست" میں چھپی تھی جس میں عقل و خرد کی فضیلت ظاہر کی گئی تھی۔ میری نظم جوشؔ صاحب کی نظر سے گزری تو وہ نہ صرف مجھ سے بلکہ بسملؔ صاحب سے بھی کچھ ناخوش ہوئے اور لوگوں سے کہا کہ دیکھیے صاحب! یہ اپنے شاگردوں سے ہمارے خلاف نظمیں لکھواتے ہیں اور ہماری دوستی کا دم بھی بھرتے ہیں۔ بعد میں جب میں "تحریک" میں کام کرنے لگا تو میری طرف سے جوشؔ صاحب کی ناراضگی اور بھی بڑھ گئی کیونکہ وہ گوپال متلؔ صاحب کو اپنا مخالف سمجھتے تھے۔ بسملؔ صاحب کے جوشؔ صاحب سے بھی مخلصانہ تعلقات تھے اور متلؔ صاحب سے بھی۔ جوشؔ صاحب کی یہ خواہش تھی اور وہ اس کا برملا اظہار بھی کرتے تھے کہ جو لوگ ان کے قریب ہیں وہ متلؔ صاحب سے دور رہیں لیکن بسملؔ صاحب نے ان کے اس مطالبے کو ہر بار خوش اسلوبی سے ٹال دیا اور اپنی وضعداری میں کبھی فرق نہ آنے دیا۔ یہ بھی ان کے مزاج کا ایک خاص پہلو ہے۔

مرحوم جگرؔ مرادآبادی صاحب سے بھی میری پہلی ملاقات بسملؔ صاحب کے ساتھ ہی ہوئی جگرؔ صاحب دلی آتے تو اُردو بازار کے قریب ہی چھتہ شیخ منگلو کے ایک پرانے مکان میں ٹھہرا کرتے تھے۔ جگرؔ صاحب اس طرح ملے کہ ان کی محبت اور شفقت کا نقش ہمیشہ کے لیے دل پر مرتسم ہو گیا۔ بعد میں بھی جب جب ان سے ملاقات ہوئی وہ اتنے ہی مہربان اور شفیق نظر آئے۔ ہر ملاقات میں بسملؔ صاحب کا ذکر ضرور آتا اور وہ دیر تک ان کی باتیں کرتے رہتے۔

اپنے زمانے کی بہت سی مشہور شخصیتوں سے بسملؔ صاحب کے قریبی تعلقات رہے ہیں اور ان سب نے ان کے کمالِ فن کا اعتراف بھی کیا ہے۔ میں نے ان کے پاس سر عبدالقادر مرحوم، حفیظ جالندھری، جوشؔ ملیح آبادی، جگرؔ مرادآبادی، نیازؔ فتحپوری، ڈاکٹر تاثیر، پطرس بخاری، ملک مجید، عبدالمجید سالکؔ، ماہرؔ القادری اور دوسرے بہت سے حضرات کے ایسے طویل طویل خطوط دیکھے ہیں جن میں ان کے شاعرانہ مرتبے کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا ہے۔ اس طرح کے خطوط آجکل کے کسی اور شاعر کے پاس ہوتے تو وہ انھیں ضرور اپنے پروپیگنڈے کا وسیلہ بناتا۔ لیکن بسملؔ صاحب کا مزاج مختلف ہے۔ انھوں نے انھیں نجی خطوط سمجھا اور کبھی عام نہیں کیا۔ بہت سے اخبارات و رسائل میں بھی ان کے فکر و فن پر گاہ بہ گاہ لکھا جاتا رہا ہے اور لکھنے والے بھی ایسے ویسے نہیں تھے مثلاً نیازؔ فتحپوری، حفیظ جالندھری یا نصر اللہ خاں عزیز وغیرہ۔ لیکن بسملؔ صاحب کی بے نیازی کہ انھوں نے ایسی کوئی تحریر اپنے پاس محفوظ نہیں

کی۔ ان کی نظم "مشاہدات" رسالہ "شعلہ و شبنم" دلی میں شائع ہوئی تو اس کے ساتھ جوش ملیح آبادی کا یہ نوٹ بھی چھپا کہ جن واردات و کیفیات کی یہ نظم ترجمانی کرتی ہے، انھیں الفاظ کی گرفت میں لانا ایک شاعرانہ معجزے سے کم نہیں۔ بسمل صاحب نے نوٹ دیکھا، خوش ہوئے لیکن ان کے پاس رسالہ بھی نہیں۔ میں نے اسے ضرور محفوظ کر لیا تھا اور جب "مشاہدات" ہی کے نام سے بسمل صاحب کا تیسرا مجموعہ چھپا تو اسے اس میں شامل کرا دیا تھا۔

اسے بسمل صاحب کی بے نیازی کہیے عالی ظرفی کہیے یا ان کی اس کیفیتِ مزاج کو کوئی اور نام دیجیے اس کا ایک پہلو اور بھی ہے ایسا کوئی دور نہیں گزرا جب کچھ شعرا نے ان سے فیض نہ اٹھایا ہو۔ دلی ہی کے بہت سے مشہور اور غیر مشہور شاعر ہیں جو ان سے مشورۂ سخن کرتے رہے ہیں۔ ان میں نئے بھی ہیں اور وہ بھی جنھیں شعر کہتے ہوئے مدت گزر چکی ہے۔ ان میں سے کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ بسمل صاحب کے اکتسابِ فیض کا اعتراف کرے، ایسے بھی تھے جنھوں نے اس تعلق کو بالارادہ مخفی رکھنا چاہا۔ بسمل صاحب نے ان سے کبھی کوئی شکایت کی نہ اس پر زیادہ متاسف ہوئے۔ دراصل اُن کا مزاج ہی یہ ہے کہ جو ان کے قریب آئے گا اُسے وہ سب کچھ بتا دینا چاہیں گے جو وہ جانتے ہیں، جو ان کے عمر بھر کے مطالعے اور ریاضت کا حاصل ہے۔ اپنے ذہنی اندوختے کو بچا کر رکھنا، اس کے صرف میں بخل سے کام لینا اُن کی طبیعت کے منافی ہے۔ اس عمل میں غالباً ان کی کسی ایسی حس کی تسکین کا راز مضمر ہے جو اس کے بغیر آسودہ نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اپنے اس ایثار پر وہ نہ ستائش کی تمنا کرتے ہیں نہ صلے کی پروا۔

میرا یہ خیال ہے اور وہ سب لوگ جنھوں نے بسمل صاحب کی شاعری کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے، میرے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ بسمل صاحب کے شاعرانہ مرتبے کا صحیح اعتراف ابھی نہیں ہوا۔ اہلِ نظر کا ایک محدود حلقہ ہے جو ان کی عظمت اور اہمیت کو محسوس کرتا ہے۔ لیکن ناقدین کے بڑے گروہ نے ان کی شاعری پر وہ توجہ صرف نہیں کی جس کی وہ حقدار ہے۔ اس کی ایک وجہ تو بسمل صاحب کی وہی خوئے استغنا ہے جس کا اوپر ذکر آیا۔ خود تشہیری کے فن سے نہ صرف یہ کہ وہ ناواقف ہیں بلکہ اس سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ کسی قسم کی ادبی گروہ بندی میں وہ کبھی شامل نہیں ہوئے۔ سستی شہرت کو انھوں نے ہمیشہ اپنے مرتبے سے فروتر سمجھا۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی عمر کا بہترین حصہ بڑے ادبی مراکز سے دور، ٹونک اور جے پور میں بسر ہوا جہاں نشر و اشاعت کے وسائل کم تھے اور ادبی سرگرمیاں مخصوص نشستوں اور

مشاعروں تک محدود تھیں۔ بسمل صاحب کے کلام کے مجموعے تاخیر سے شائع ہوئے۔ ان کا پہلا مجموعہ "نشاطِ غم" تھا جس کا پیش لفظ جوش ملیح آبادی نے لکھا تھا۔ یہ مجموعہ منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز نے اپنے ان دنوں میں شائع کیا جب وہ اپنا اردو کا کاروبار بند کرنے والے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مجموعہ چھپا اور فرم کے کسی گودام میں پہنچ کر وہیں کا ہو رہا۔ دوسرا مجموعہ "کیفِ الم" بھی اسی فرم کی طرف سے چھپا اور اسی انجام کو پہنچا۔ دونوں مجموعوں کی بمشکل پچاس پچاس سو سو کاپیاں صرف بسمل صاحب کے قریبی حلقۂ احباب تک پہنچ سکیں۔ ان کا تیسرا مجموعہ "مشاہدات" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے چند ہی روز بعد حکومتِ کشمیر کی طرف سے جس کے سربراہ ان دنوں بخشی غلام محمد تھے، کتاب کی یک مشت خریداری عمل میں آگئی۔ بخشی صاحب بسمل صاحب کے قدردانوں میں تھے، بسمل صاحب نے کتاب انھیں نذر کی تو قدرافزائی کی ایک یہ صورت بھی ان کے ذہن میں آئی۔ کتاب کی یک مشت خریداری سے بسمل صاحب کو مالی فائدہ ضرور پہنچا لیکن نقصان یہ ہوا کہ ان کی یہ کتاب بھی ایسے بہت سے ہاتھوں تک نہ پہنچ سکی جن تک اسے پہنچنا چاہیے تھا۔ بسمل صاحب کے کلام کا چوتھا مجموعہ "اوراقِ زندگی" ہے جو اپریل ۱۹۷۱ء میں چھپا۔ یہ میرا مرتب کیا ہوا ہے اور اس میں میں نے ان کے پچھلے تینوں مجموعوں سے بھی بہت سی چیزیں لی ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ "نشاطِ غم" "کیفِ الم" اور "مشاہدات" کے بھی نئے ایڈیشن شائع ہوں تاکہ بسمل صاحب کا پورا کلام یکجا ہو کر اہلِ نظر کے سامنے آسکے۔ "اوراقِ زندگی" کی اشاعت کے بعد بھی بسمل صاحب نے بہت کچھ کہا ہے اس کی بھی ترتیب واشاعت ہونی چاہیے۔

بسمل صاحب مشاعروں میں اپنی شاعری کے ابتدائی دور ہی سے شریک ہوتے رہے ہیں اور ملک کے طول وعرض میں انھوں نے بے شمار چھوٹے بڑے مشاعرے پڑھے ہیں۔ ان میں سے کچھ مشاعروں کی یاد بسمل صاحب کے ذہن میں اب تک تازہ ہے مثلاً جے پور کا ایک مشاعرہ جو دو دن تک جاری رہا تھا اور جس میں اس وقت کے تمام مشاہیر شعرا شریک تھے۔ یا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سلور جوبلی جشن کا مشاعرہ۔ بسمل صاحب ان مشاعروں کی فضا کو یاد کرتے ہیں اور اس کا موازنہ مشاعروں کے موجودہ ماحول سے کرتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں اداسی کی پرچھائیاں تیرنے لگتی ہیں۔ مشاعروں میں وہ اب بھی شریک ہوتے ہیں لیکن محض معاش کے تقاضوں سے مجبور ہو کر۔ ان کا کلام دلچسپی اور توجہ سے سنا جاتا

ہے، داد بھی دی جاتی ہے، وہ ایک غزل یا نظم سنا چکیں تو دوسری کا مطالبہ بھی ہوتا ہے لیکن اس دوران میں بسمل صاحب کے چہرے سے بیزاری برابر جھلکتی رہتی ہے۔ جو سامعین متشاعروں کے کلام پر، داد وتحسین کے نعرے بلند کر چکے ہوں، ان کے سامنے اپنا کلام پڑھ کر بسمل صاحب کو جو اذیت ہوتی ہوگی، وہ کسی طرح بھی ناقابلِ فہم نہیں۔ مائک پر کوئی تک بند کھڑا ہو اور اس کے بے تکے اشعار پر داد وتحسین کا بے ہنگم شور بلند ہونے لگے تو بسمل صاحب پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھیں گے اور کسی شناسا چہرے پر نظر پڑتے ہی کہیں گے: ان لوگوں کو شرم نہیں آتی؟ لعنت ہے۔

یو۔ پی کے ایک مشاعرے کا ذکر ہے۔ اس مشاعرے کو کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کنڈکٹ کر رہے تھے، ان کے برابر ہی بسمل صاحب کی نشست تھی۔ سامعین میں سے ایک صاحب اٹھے اور مجمع کو لانگتے پھلانگتے کسی طرح اسٹیج کے قریب پہنچے، ہاتھ لمبا کر کے بسمل صاحب کے سامنے کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ پھینکا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ملتجی ہوئے کہ اسے کنور صاحب کو دے دیجیے۔ بسمل صاحب نے اس مڑے ہوئے پرزے کو کھولا، اس پر ایک نظر ڈالی اور اسی جگہ رکھ دیا جہاں وہ آکر گرا تھا۔ اُدھر وہ صاحب منتظر کہ ان کی فرمائش میر مشاعرہ تک پہنچ جائے تو وہ اپنی جگہ پر جا کر بیٹھیں، جب کچھ وقت گزر گیا تو انھوں نے ایک بار پھر بسمل صاحب کو متوجہ کیا۔ بسمل صاحب نے ان کی طرف بڑی ناگواری سے دیکھا اور بولے: یہ ہدایت نامہ؟ دیکھیے صاحب کوشش کرتا ہوں، پہنچا سکا تو ضرور پہنچا دوں گا۔ یہ میں عرض کر ہی چکا ہوں کہ بسمل صاحب کنور صاحب کے بالکل برابر ہی تشریف فرما تھے۔

بسمل صاحب میر کے لہجے کی گھلاوٹ اور گمبھیرتا، غالب کے تفکر اور مومن کی استادی کے بہت قائل ہیں۔ وہ حالی کی متانت اور سادگی کے دلدادہ ہیں تو داغ کی چٹخی زبان کے بھی رسیا ہیں لیکن آگے چل کر اس نے داغ کے بعض شاگردوں کے کلام میں جو صورت اختیار کی ہے اسے وہ پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ خالص زبان کی شاعری کا تصور ان کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ اور وہ اسے شاعری کے نام پر ایک طرح کا اتہام قرار دیتے ہیں۔

اپنے عہد کے مشاہیر میں میں نے انھیں یگانہ، حفیظ جالندھری، جگر مرادآبادی اور فراق گورکھپوری کی تعریف کرتے اکثر سنا ہے۔ جگر صاحب سے انھیں ایک شکایت ہے

نہ وہ کہیں کہیں بہت زیادہ تصوّف زدہ ہو جاتے ہیں، لیکن ان کی نظر میں جگر صاحب کی شاعری کا اصلی جوہر بھی انہی اشعار میں کھلتا ہے جن کا خمیر عشق و تصوّف کے آمیزے سے اٹھا ہے۔ ان کے رندانہ کلام کو وہ زیادہ وقیع نہیں سمجھتے۔ فراق صاحب کی فنی کمزوریاں ہیں جو بسمل صاحب کو پریشان کرتی ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اپنے بہت سے اچھے اشعار میں بھی فراق صاحب اصلاح و ترقی کی گنجائشیں چھوڑ دیتے ہیں اور ایسا شاید ان کی کم توجہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لال قلعے کے جشن جمہوریت کے ایک مشاعرے میں فراق صاحب غزل سنا رہے تھے۔ انھوں نے مقطع پڑھا:

فراق گرمِ سخن ہے مذاق بند کرو
وہ دیکھو ہو گئے سنجیدہ سب در و دیوار

بسمل صاحب مائک کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ انھوں نے دوسرا مصرعہ اس طرح دہرایا:

وہ دیکھو ہو گئے سنجیدہ ثابت و سیّار

اقبال کو بسمل صاحب اس دور کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کا ذکر آ جائے تو بسمل صاحب کہیں گے: اللہ کی پناہ! یہ شاعری ہے یا اعجاز! اور پھر دیر تک اقبال کے اردو یا فارسی کے اشعار سناتے رہیں گے اور ان کے محاسن پر بھی روشنی ڈالتے جائیں گے۔

جوش ملیح آبادی سے بسمل صاحب کے بڑے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ ان کی شاعری پر گفتگو کا جب بھی کوئی موقع آیا انھوں نے جوش صاحب کی بیانیہ قوت کی تعریف کی۔ ان کے تخیّل کو سراہا یہ بھی کہا کہ وہ کیا بے تکان شعر کہتے ہیں اور مختلف النّوع موضوعات پر انھوں نے کتنا کچھ کہا ہے لیکن نفسِ شاعری کو کبھی زیرِ بحث نہیں لائے۔ اس سے میں یہی سمجھا ہوں (اگر میں غلطی پر ہوں تو مجھے معاف کیا جائے) کہ وہ جوش صاحب کی شاعری کے زیادہ قائل نہیں۔ ایک بے تکلّف محفل میں جوش صاحب حسبِ عادت غزل اور غزل گو شاعروں کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ بسمل صاحب نے کہا: جوش صاحب آپ کی طبیعت سوز و گداز سے خالی ہے، غزل ان کا تقاضا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ غزل کو پسند نہیں کرتے۔ جوش صاحب نے کہا: نہیں صاحب! ہماری طبیعت میں تو بڑا سوز و گداز ہے اور ثبوت میں اپنی کسی نظم کا یہ شعر پڑھا:

57828
6-10-1976

میرے رونے کا جس میں قصّہ ہے
عمر کا بہترین حصّہ ہے

بسمل صاحب نے جوش صاحب کی طرف دیکھا اور کہا: خدا کی قسم بچپن پر اس سے اچھا شعر آج تک سننے یا دیکھنے میں نہیں آیا۔

بسمل صاحب نے کیا بہ لحاظِ ہیئت کیا بہ لحاظِ موضوع، شاعری کی کئی اصناف میں دادِ سخن دی ہے، غزل، نظم اور رباعی تو وہ تواتر کے ساتھ کہتے رہے ہیں، قطعات اور چار بیتیں بھی کہی ہیں اور عجب نہیں کہ سہرے بھی لکھے ہوں۔ مرثیے تو لکھے ہی ہیں جن میں سے کچھ ان کے مجموعوں میں شامل ہیں۔ ان کی چار بیتیں ٹونک میں اب بھی پڑھی جاتی ہیں۔ بسمل صاحب کا کہنا یہ ہے کہ شاعری کی اہم ترین صنف غزل ہے۔ جو شاعر اچھی غزل کہہ سکتا ہے وہ دوسری اصناف میں بھی کامیاب فکر کر سکتا ہے، جسے غزل پر قدرت نہیں اسے وہ نامکمل شاعر سمجھتے ہیں۔ میں ابتداءً نظمیں زیادہ کہتا تھا، بسمل صاحب نے ہمیشہ زور دیا کہ مجھے غزل پر بھی اتنی ہی توجہ صرف کرنی چاہیے۔

ترقی پسند شاعری کے بارے میں بسمل صاحب کی رائے کبھی اچھی نہیں رہی۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ بعض حالات میں شاعری سے تبلیغ کا کام بھی لیا جا سکتا ہے لیکن یہ حالات ہنگامی ہوں گے اور ایسی شاعری کی اہمیت بھی وقتی ہو گی۔ شاعری ان کے نزدیک شخصی اظہار کا نام ہے جس کی مثالیں ترقی پسند شاعری میں بہت کم ملتی ہیں۔ بعض ترقی پسند شاعروں کی ذاتی صلاحیت کے وہ معترف ہیں مثلاً جاں نثار اختر، اور علی سردار جعفری لیکن وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ترقی پسندی کے پھیر میں پڑنے سے ان کی صلاحیتوں کو ضرر پہنچا ہے۔ ترقی پسند شاعری سے اُن کی بدظنی کا ایک اور سبب صحتِ زبان و بیان کی طرف سے ترقی پسند شاعروں کا بے نیازانہ رویّہ ہے جس کی سب سے بری مثال ان کی نظر میں فیض احمد فیض ہیں۔ اسی رویے کی وجہ سے وہ بہت سے جدید شاعروں سے بھی ناخوش نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ روایت سے "انحراف" یا مروجہ اسالیب کی "شکست و ریخت" کے لیے جس غور و نظر کی ضرورت ہوتی ہے اس سے اکثر جدید شاعر محروم ہیں۔ اور یہ ان کا عجز ہے جسے وہ نئے تجربات کا نام دے کر خوش ہو لیا کرتے ہیں۔ بسمل صاحب کی بات کا شاید بہت سے لوگ برا مانیں لیکن بسمل صاحب جو کچھ کہتے ہیں دلسوزی سے کہتے ہیں، تعصب سے نہیں۔ بسمل صاحب کے ہمعصر اردو کے ایک

مشہور شاعر ہیں جو دلی ہی میں مقیم ہیں - ایک دن باتوں باتوں میں انھوں نے فخر آمیز لہجے میں انکشاف کیا کہ گزشتہ تیس سال سے انھوں نے اپنے سوا کسی دوسرے شاعر کے کلام کو کبھی توجہ نہیں سمجھا اور جن لوگوں نے تقسیم کے بعد لکھنا شروع کیا ہے، ان میں سے تو بہتوں کے نام سے بھی وہ ناواقف ہیں۔ بسمل صاحب کا معاملہ برعکس ہے، وہ آج بھی مطالعے کے شائق ہیں۔ اور کئی نئے شاعر ہیں جن کا کلام پڑھ کر میں نے انھیں خوش ہوتے بھی دیکھا ہے، جیسے تلخ، راز بانی، کمار پاشی، بشر نواز، بمل کرشن اشک، مصور سبزواری، مظفر حنفی، امیر قزلباش اور کچھ دوسرے بھی جن کے ہاں انھیں وہ چیز نظر آتی ہے جسے وہ شاعری کا جوہر سمجھتے ہیں۔

بسمل صاحب گزشتہ کئی برس سے بڑے سخت حالات سے نبرد آزما ہیں - بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ان حالات کی ذمہ داری ان کی افتادِ طبع پر بھی ہے - لیکن میں کہتا ہوں کہ دنیا نے بھی ان پر کچھ کم ستم نہیں توڑے - اور ان کے مقدر نے بھی انھیں بہت ستایا ہے ماحول ان کے لیے زیادہ سازگار تو کبھی نہیں رہا، طرح طرح کی ایذائیں اور تکلیفیں انھیں پہنچتی ہی رہیں، لیکن جس حادثے نے پیرانہ سالی میں ان کی کمر توڑ دی وہ ان کی لاڈلی نوجوان بیٹی ثریا سعیدی کا جل کر مرجانا تھا - یہ حادثہ بڑے ہی قیامت آثار حالات میں رونما ہوا۔ اس سانحے کو پانچ چھ سال گزر چکے ہیں لیکن اس کے جاں گداز اثرات سے بسمل صاحب ابھی تک بحال نہیں ہو سکے ہیں - ثریا مرحومہ کی یاد میں جو خون کے آنسو ان کی نوکِ قلم سے اشعار کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر گر کر نقش ہو گئے ہیں، ان میں ایک شعر یہ بھی ہے:

اک کلی اُمید کی مرجھا کے یہ کیا کر گئی
مجھ سے اب دیکھا نہیں جاتا ہے سوئے گلستاں

بسمل صاحب کی شاعری میں حزن و ملال کے عناصر ابتدا ہی سے کارفرما رہے ہیں لیکن اس سانحے کے بعد ان کے کلام میں غم کی لے اور تیز ہو گئی - ناشناسا لوگوں کی موجودگی میں وہ پہلے بھی زبان کم ہی کھولتے تھے بلکہ اس موجودگی سے گھبراتے بھی تھے لیکن اب تو انھیں جیسے چپ سی لگ گئی ہے - بے تکلف محفل میں بھی اب ان کی وہ گفتگو مشکل ہی سے سننے کو ملتی ہے جو دلِ زندہ کی ترجمانی کرتی ہو ورنہ ان محفلوں میں ان کا اندازِ گل افشانیِ گفتار واقعی دیدنی ہوا کرتا تھا -

ایک فرضی کردار میر جواد علی سے بسمل صاحب کے سبھی احباب واقف ہیں - بسمل صاحب

جب کوئی ایسا شعر سنتے یا پڑھتے جس کی صحت میں انھیں شبہ ہو تو کہتے : بھئی ابھی ابھی میر جواد علی کا پیغام ملا ہے۔ یہ پیغام اعتراض پر مبنی ہوتا اور بہت ہی پُرلطف زبان میں۔ اپنے لطائف وظرائف کو بھی بسملؔ صاحب، میر جواد علی کے نام ہی سے منسوب کر دیا کرتے تھے۔ شعری بھوپالی صاحب سے بسملؔ صاحب کے بے تکلفانہ مراسم ہیں۔ ایک بار وہ دلی آئے بسملؔ صاحب سے بھی ملے۔ کہنے لگے : بسملؔ صاحب! میں اپنے کلام کا مجموعہ چھپوانا چاہتا ہوں، رقم کا انتظام ہو گیا ہے۔ اب کلام مرتّب کرنا ہے۔ بسملؔ صاحب نے مسکراتے ہوئے شعری صاحب کی طرف دیکھا اور کہا : کلام جمع کرنے کی زحمت نہ کیجیے رقم میر جواد علی کے حوالے کر دیجیے مجموعہ چھپا چھپایا آپ کے پاس پہنچ جائے گا اور کلام بھی نوک پلک سے درست ہو گا۔

بسملؔ صاحب کبھی کبھی ایسے شعر بھی کہتے ہیں جنھیں وہ کسی قیاسی نام سے منسوب کر دیتے ہیں۔ دلی میں ایک شادی ہوئی۔ لڑکی کے والد شاعر تھے لیکن شادی میں چونکہ چند مقتدر سیاسی شخصیتوں کی شرکت بھی متوقع تھی اس لیے انھوں نے دعوت نامے جاری کرنے میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی احتیاط برتی۔ بسملؔ صاحب کو ان کی یہ ادا بُری لگی اور انھوں نے یہ تین شعر کہہ کر 'عیسیٰ محمد آبادی' کے نام سے بہت سے دوستوں کو سنائے۔

بزمِ شادی تھی بپا اک شاعرِ عزہ کے ہاں — دخترِ نیک اختر اس کی ہونے والی تھی رلیز
حضرتِ عزہ نے لکھا اپنے والد کو یہ خط — کچھ برا دل میں نہ لائیں قبلہ و کعبہ پلیز
کر سکوں گا آپ کو مدعو نہ اس تقریب میں — ہوں گے اس شادی میں شامل صرف کچھ وی آئی پیز

مولانا علیم اختر مظفر نگری مرحوم کو بسملؔ صاحب بہت عزیز رکھتے تھے اور انھیں صرف مولانا کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ علیم اختر صاحب کی شاعری کا رنگ عاشقانہ تھا مگر عملاً وہ مذہبی آدمی تھے اور وضع قطع اہلِ خانقاہ سے ملتی جلتی تھی۔ اپنے گھر سے اور گھر والوں سے بہت انسیت رکھتے تھے۔ دفتر کے اوقات کے سوا کم ہی باہر نکلتے لیکن ہفتے میں دو تین بار یہ بھی ہوتا کہ دفتر سے اٹھے اور بسملؔ صاحب سے ملنے اُردو بازار چلے آئے۔ بسملؔ صاحب ان کی کمزوری سے واقف تھے وہ دانستہ کوشش کرتے کہ انھیں زیادہ دیر تک روکے رکھیں۔ شام ڈھلنے لگتی تو علیم اختر صاحب پریشان ہونے لگتے۔ گھر کی غیر حاضری سے بچنے کے لیے وہ مشاعروں میں بھی کم شریک ہوتے تھے اور اگر شریک ہوتے تو چاہتے کہ انھیں ابتدا ہی میں پڑھوا دیا جائے تاکہ وہ جلد گھر پہنچ سکیں۔ ایسے موقعوں پر اپنی صفائی میں وہ مولانا حسرت موہانی کا یہ شعر اکثر پڑھتے تھے :

کتنی بے درد ہے تاثیرِ محبت کہ انھیں بستر ناز پہ سوتے سے جگا رکھا ہے

علیم اختر صاحب تو بسمل صاحب سے ملنے آتے ہی تھے، بسمل صاحب بھی ان کے پاس جاتے رہتے تھے۔ ایک شام وہ ان کے ہاں پہنچے، میں بھی ساتھ تھا۔ معلوم ہوا علیم اختر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ ہم لوگ بیٹھک میں بیٹھ گئے اور ان کا انتظار کرنے لگے۔ اندر سے چائے آئی، پھر پان آئے لیکن علیم اختر صاحب نہیں پلٹے۔ آخر بسمل صاحب نے جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا اور اس پر یہ شعر لکھ کر علیم اختر صاحب کی میز پر رکھ آئے:

وہ سجادہ نشینِ کوئے جاناں بھی غائب ہیں خدا کی شان، اپنے گھر سے مولانا بھی غائب ہیں

بسمل صاحب نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیگم سے پانچ اولادیں ہوئیں۔ بڑی بیٹی ڈاکٹر اسما سعیدی اور چھوٹی بیٹی پروین سعیدی، ان کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ پروین سے بڑی بیٹی ثریا اب اس دنیا میں نہیں۔ بڑے بیٹے حبیب سعیدی لاہور میں ہیں جہاں وہ مطب کرتے ہیں۔ چھوٹے بیٹے محبوب سعیدی فریدآباد کے ایک کالج میں لیکچرار ہیں۔ دوسری بیگم اور ان کی تین بچیاں تقسیم کے بعد پاکستان چلی گئی تھیں اور ان دنوں کراچی میں مقیم ہیں ـــــ بسمل صاحب کے سب سے پرانے شاگرد غالباً داد سعیدی تھے وہ بھی پاکستان چلے گئے تھے، وہیں انتقال کیا۔ بسمل صاحب انھیں بھی اولاد ہی کی طرح سمجھتے تھے۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ "شعلۂ جاں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ قمر ہاشمی بھی بسمل صاحب کے پرانے شاگردوں میں ہیں اور قریبی رشتے دار بھی۔

اس مضمون کا عنوان میں نے 'بلا جی' رکھا ہے۔ یہ وہ نام ہے جس سے بسمل صاحب کے بچے انھیں مخاطب کرتے ہیں۔ میری زبان پر یہ نام اچانک ہی چڑھ گیا۔ غالباً ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ ان دنوں دلّی میں بار بند نہیں ہوئے تھے۔ ٹونک سے میرے رشتے کے ماموں نواب زادہ معین الدین خاں صاحب تشریف لائے اور مجھے اور بسمل صاحب کو لے کر نئی دلّی کے ایک بار میں جا بیٹھے۔ میں شراب نہیں پیتا تھا لیکن اس روز میں نے پی اور چونکہ اناڑی تھا اس لیے کچھ زیادہ ہی پی گیا۔ آزاد ہند ہوٹل میں ہم لوگ بسمل صاحب کے کمرے پہنچے تو میں بے حال تھا۔ میں بسمل صاحب کے بستر پر گر گیا اور پھر مجھے خبر نہیں کہ رات کیسے گزری۔ صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ بسمل صاحب میرے سرہانے ایک کرسی ڈالے بیٹھے ہیں اور پلنگ کی پٹی کے پاس سنترے کے ڈھیر سے چھلکے پڑے ہیں۔ بسمل صاحب نے پوری رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی اور سنترے کا عرق میرے حلق میں ٹپکاتے رہے تھے۔ ان سے آنکھیں چار ہوئیں تو بے ارادہ میری زبان سے نکلا ـــــ بلا جی!

(ڈاکٹر) اسلم پرویز

’مہر و محبّتِ تمام‘

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں عربک اسکول کا طالب علم تھا۔ شعر و شاعری کا ذوق تو شاید اس وقت مجھ میں پوری طرح نہیں پیدا ہوا تھا ہاں اس میں دلچسپی خوب لیا کرتا تھا۔ نئے اور پرانے رسائل کے حصّۂ نظم کا مطالعہ اور غزلوں کو اپنی بے سُری آواز میں گا گا کر پڑھنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ یہ شاید وہ زمانہ تھا جب دلّی کی تہذیبی زندگی پر مشاعرے اور مشاعروں پر ترنّم بری طرح حاوی تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے بھی شاعری کا شوق چرّایا اور میں نے اوٹ پٹانگ شعر کہنے شروع کر دیے۔ میرے یہ اشعار نہ صرف بحر سے خارج ہوتے تھے بلکہ وزن اور بحر کا کوئی تصوّر ان کی تخلیق میں سرے سے شامل ہی نہیں تھا۔ قافیہ کی تمیز بھی برائے نام ہی تھی البتہ ردیف کا خیال ضرور رکھا جاتا تھا جب میں یہ شعر اپنی رف کاپی سے فیر کاپی میں نقل کرتا تو طویل مصرعوں کے الفاظ کو گھٹا کر اور چھوٹے مصرعوں کے حروف کو کشش دے کر اس طرح لکھتا کہ بظاہر دونوں مصرعے برابر کے نظر آئیں اور یہ عمل اس وقت میرے نزدیک گویا شعر کو نوک پلک سے درست کرنے کے مترادف تھا۔ ہمارے اسکول میں اس وقت اُردو کے ایک استاد تھے جو شاعر بھی تھے لیکن استاد اور شاعر دونوں سے زیادہ وہ مولوی لگتے تھے۔ لمبا چوڑا قد گھنی سیاہ داڑھی ناک پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک ڈھیلی ڈھالی شیروانی جس کے بٹن آگے سے ہمیشہ کھلے ہوتے، ڈھیلی موری کا لٹھے کا پاجامہ، روزے نماز کے پابند۔ اسکول میں وہ اُردو کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ دینیات کے ممتحن بھی ہوا کرتے تھے ان بزرگ کا نام تھا رہبر پرتاپ گڑھی —— اور بہت سی باتوں کے ساتھ میرے کانوں میں کسی کی کہی ہوئی یہ بات بھی کہیں سے پڑی ہوئی تھی کہ ”جائے استاد خالیست“ چنانچہ میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ اپنا کلام رہبر صاحب کو دکھا لیا کروں۔ شاید اس کی ضرورت

مجھے یوں بھی محسوس ہوئی تھی کہ ایک دو مرتبہ چمنستان، پارس، چترا اور آریہ ورت جیسے پرچوں سے میرا بھیجا ہوا کلام واپس آچکا تھا۔ میں اپنے کلام کی ایک دستے کی فیر کاپی کو لے کر رہبر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ قبلہ مجھے شعر لکھنے کا شوق ہے آپ میرے استاد بن جائیں اگر کلام پر بھی اصلاح دے دیا کریں تو کیا ہی اچھا ہو۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید وہ یہ کہیں گے کہ تم اپنی کاپی چھوڑ جاؤ میں دیکھ کر بتا دوں گا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ انھوں نے مجھ سے کاپی سے چیدہ چیدہ اشعار سنانے کی فرمائش کی۔ ایک دو اشعار سننے کے بعد انھوں نے کہا کہ صاحبزادے باتیں تو شاعرانہ کر لیتے ہو مگر شاعری نہیں کر پاتے۔ شعر میں ایک چیز وزن بھی ہوتی ہے اسی وزن کی بنا پر نظم اور نثر میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ شعر کے ضمن میں وزن کا لفظ میں پہلی مرتبہ سن رہا تھا اس لیے باوجود کوشش کے میں وزن کا تصور اپنے دماغ میں نہیں بٹھا سکا۔ جب میں نے رہبر صاحب سے 'وزن' کی وضاحت چاہی تو انھوں نے ایک مصرعے کی تقطیع میرے سامنے اس طرح کی :

بشر راز دلی کہہ کر ذلیل و خوار ہوتا ہے

'بشر راز مفاعیلن' دلی کہہ کر مفاعیلن' ذلیل و خوا۔ مفاعیلن' ہوتا ہے مفاعیلن' جس وقت رہبر صاحب نے تقطیع مکمل کی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دماغ کے رگ و ریشے میں موزونیِ طبع سرایت کر گئی ہو۔ میں آج تک بھی عروض سے واقف نہیں ہوں اور نہ ہر قسم کے ارکان کی صحیح تقطیع کر سکتا ہوں لیکن اتنا ضرور ہے اس روز سے آج تک لگ بھگ تمام رائج بحروں میں خود کو موزوں طبع پاتا ہوں۔

ملک اگرچہ تقسیم ہو چکا تھا لیکن دلّی کی بساطِ ادب ابھی اجڑی نہیں تھی بلکہ پاکستان سے آئے ہوئے پنجابی ادیبوں اور شاعروں نے اور سماں باندھ دیا تھا۔ وہ لوگ جن کا کلام کبھی ہم نے پرائمری اسکول کے نصاب کی کتابوں میں پڑھا تھا اور جو ہمیں شاعری کی دنیا کے اللہ میاں جیسے لگتے تھے، جو نہ جانے کہاں سے بیٹھے بیٹھے اپنا کلام نصاب کی کتابوں میں بھیج رہے تھے، اب ہمیں اردو بازار میں گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے پہلی مرتبہ منشی تلوک چند محروم کو دیکھا تھا تو کتنا حیران اور ششدر ہوا تھا۔ دلّی میں ان دنوں مشاعروں کا بازار گرم تھا شاید کوئی طرحی مشاعرہ تھا اس میں بسمل شاہجہانپوری کی ایک غزل جس میں بے شمار مطلعے ہی مطلعے تھے مشاعرے کی پبلک میں بہت مقبول ہوئی تھی۔ کچھ تو

اس لیے کہ غزل کی زمین جاندار تھی اور کچھ اس لیے کہ بسمل شاہجہاں پوری صاحب کا ترنم بڑا قاتل تھا۔ اور کلام تو اس زمانے کے مذاق و معیار کے مطابق جیسا تھا ویسا تھا ہی۔ غزل کا پہلا مطلع یہ تھا :

سبو بر دوش مینا در بغل مستانہ وار آئے　　　بقدرِ ظرف پی کر سے کدے سے بادہ خوار آئے

بسمل شاہجہاں پوری صاحب اپنی اس غزل کے ساتھ دلّی کے مشاعروں میں اس قدر مقبول ہوئے کہ میرے دماغ میں بسمل کے معنی صرف بسمل شاہجہاں پوری ہو کر رہ گئے۔ انھی دنوں دلّی کے روزنامہ "اخبار تیج" کا ایک سلور جوبلی نمبر شائع ہوا جو رسالے کی شکل میں تھا۔ ہمارے ہاں اُردو کا اخبار تیج ہی آیا کرتا تھا چنانچہ اخبار والا وہ سلور جوبلی نمبر بھی ڈال گیا۔ میرے خوب مزے آئے اور میں نے اس رسالے کے حصۂ نظم کو مزے لے لے کر چاٹ کرنا شروع کر دیا اس رسالے میں مجھے بسمل نام کے کئی شاعر نظر آئے بسمل الہ آبادی اور نہ جانے کون کون شاید بسمل سعیدی بھی تھے لیکن مجھے یہ سب بسمل، بسمل شاہجہاں پوری کے مقابلے میں نقلی نظر آئے ——— اس کے بعد ایک مرتبہ ریڈیو سے کوئی مشاعرہ نشر ہو رہا تھا اس میں جب بسمل سعیدی صاحب نے اپنا کلام پڑھنا شروع کیا تو میں سخت بے لطف ہوا ان میں بسمل والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اوّل تو وہ کلام تحت میں پڑھ رہے تھے اور پھر کلام اتنا مشکل کہ کچھ پلّے نہ پڑے لیکن جوں جوں میں بڑا ہوتا جا رہا تھا اور دلّی کی ادبی زندگی میں میری دلچسپیاں بڑھتی جا رہی تھیں، یہ نام 'بسمل سعیدی' بھی بار بار میرے سامنے گھوم پھر کر آتا تھا۔ بسمل کا 'شاہجہاں پوری' اب رفتہ رفتہ اور غیر شعوری طور پر میرے ذہن میں 'سعیدی' بنتا جا رہا تھا۔ انھیں ابھی تک میں نے دیکھا نہیں تھا اس لیے میں جب کبھی بھی ان کی شکل کا تصور کرنے کی کوشش کرتا تو ذہن شکل تو نہ بنا پاتا تھا لیکن ہاں تصور میں ایک گھنی سیاہ داڑھی ضرور لہراتی سی نظر آتی تھی شاید یہ وہی داڑھی تھی جسے میں نے اپنی زندگی میں سب سے پہلے 'بسمل' کے چہرے پر لہراتے دیکھا تھا یعنی بسمل شاہجہاں پوری کے چہرے پر۔

اس دوران میں رہبر صاحب عربک اسکول کو خیرباد کہہ کر پرتاپ گڑھ واپس جا چکے تھے۔ کچھ دن انھوں نے بذریعۂ ڈاک میرے کلام کی اصلاح کی پھر رفتہ رفتہ یہ سلسلہ منقطع ہو گیا میں نے بھی شعر کہنا چھوڑ دیا اور اس دور کا کلام بھی دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گیا۔ میں اُس کلام کو اب مشقِ سخن پہ محمول کرتا ہوں لیکن میری طبع موزوں رہی ہے

صاحب کا سب سے بڑا ورثہ ہے۔

دلّی کے اُردو بازار میں جہاں آجکل کیفی لائبریری ہے اس کے نیچے ایک چائے خانہ ہوا کرتا تھا جس کا نام تھا "تاج ہوٹل" ہم اکثر یہاں چائے پینے جایا کرتے تھے۔ اس ہوٹل میں میں نے پہلی مرتبہ ظ۔ انصاری کو دیکھا جو اس زمانے میں 'شاہراہ' کے مدیر تھے۔ یہیں انور عظیم، مخمور جالندھری، فکر تونسوی اور پرکاش پنڈت کی چوکڑی بھی جمتی تھی جو یا تو 'شاہراہ' کے دفتر سے آرہے ہوتے تھے یا وہاں جانے والے ہوتے تھے کبھی کبھار میں نے یہاں غلام ربّانی تاباں صاحب کو بھی دیکھا جو باوجود اپنے کھچڑی بالوں کے سیاہ چشمے میں خوبصورت نظر آتے تھے (اب تو ان کے بقیہ سفید بال بھی کالے ہو گئے ہیں) اس ہوٹل میں ایک ذرا چوڑا خوبصورت مگر بے رعب سا لڑکا منیجر کے فرائض انجام دیا کرتا تھا جو بل کاٹنے کے وقت کو چھوڑ کر بقیہ تمام وقت گنگناتا رہتا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ صاحب شاعر ہیں۔ بے چارے پر بڑا رحم آیا اور اس کے ساتھ ہی ہوٹل کا مستقبل بھی کچھ تاریک نظر آنے لگا۔ اس ہوٹل میں خاصی خاصی دیر ایک دراز قد اور چھریرے بدن کے صاحب کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھے نظر آتے تھے تاج ہوٹل کے منیجر سے ان کی بات چیت زیادہ ہوتی تھی۔ ایک دن وہ کسی سلسلے میں جوش صاحب کا ذکر کر رہے تھے کہ خلیق انجم نے اچانک یہ دریافت کیا یہ صاحب بسمل سعیدی ہیں۔ اس دن سے میں نے بسمل صاحب کی باتوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ ہم تقریباً روز یہاں آتے تھے اور بسمل صاحب بھی ہمیں تقریباً روز ہی یہاں بیٹھے ہوئے ملتے۔ رفتہ رفتہ پھر یوں ہوا کہ میں بسمل سعیدی کو ہی اصل بسمل سمجھنے لگا لیکن ابھی تک میری بسمل صاحب سے دور دور کی ہی ملاقات تھی مجھے ان سے ہم کلام ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔

چار پانچ سال بعد شعر کہنے کی ترنگ پھر آئی۔ میں نے ابھی ایک ہی غزل کہی تھی کہ اچانک دلّی سے ہفت روزہ "آئینہ" جاری ہوا اور مجھے اس میں چھوٹی سی نوکری مل گئی۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ "آئینہ" کے اسٹاف میں ایک طرف سے ظ۔ انصاری اور دوسری طرف سے بسمل سعیدی صاحب بھی آجڑے۔ یہی وہ موقع تھا جب پہلی بار بسمل صاحب سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا۔

"آئینہ" میں بسمل صاحب کا کام اشاعت کے لیے آئی ہوئی منظوم تخلیقات کو

دیکھنا تھا۔ "آئینہ" ایک سال جاری رہا اس ایک سال کے عرصے میں بسمل صاحب کے ساتھ جو وقت گزرا وہ یادگار رہے گا۔ کبھی کبھی "آئینہ" کے دفتر میں تاج ہوٹل کا نوجوان منیجر بھی بسمل صاحب سے ملنے آتا تھا۔ نوجوان محمود سعیدی تھا۔ میں نے بسمل صاحب کو اپنے شعر دکھانے شروع کر دیے اور انھوں نے بھی یہ کام بخوشی اپنے ذمے لے لیا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ میں نے بسمل صاحب کے آگے باقاعدہ طور پر زانوئے ادب تہ نہیں کیا اور شاید ان کے کسی بھی شاگرد نے ایسا نہیں کیا۔ بسمل صاحب خود بھی کبھی اس کے خواہش مند نہیں رہے۔ وہ کلام پر اصلاح استاد کی طرح نہیں بلکہ مشیر کی طرح دیتے ہیں اور نہ تعلقات کو محض اصلاحِ شعر تک محدود رکھتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ وہ دوستی اور رفاقت بھی چاہتے ہیں۔ جتنا وقت بھی ان کے ساتھ گزرے وہ برابر کسی نہ کسی عنوان سے مستفید کرتے رہتے ہیں۔ بسمل صاحب کا اصلاحِ شعر کا طریقہ بھی انوکھا ہے۔ بسمل صاحب کی اصلاح سے نہ آپ کے شعر کا مفہوم بدلتا ہے نہ آپ کا انفرادی اندازِ بیان، وہ تو صرف اپنے تجربے اور مشاقی کی مدد سے آپ کے ہاں مشقِ سخن کی جو کمی رہ گئی ہو اسے پورا کر دیا کرتے ہیں۔ ان کی اصلاح بڑی برجستہ اور انتہائی غیر معمولی طریقہ پر معمولی یا مختصر ہوا کرتی ہے اور اس میں وہ شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ بعض اوقات محض ایک لفظ کے ردّو بدل سے شعر کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں۔ جن لوگوں کے ساتھ انھیں خاص تعلق ہے ان کی تربیت کو وہ ہر وقت پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ آپ ان کے سامنے نظم پڑھیے یا نثر، ان کے ساتھ سنجیدہ گفتگو کیجیے یا بے تکلف باتیں وہ اپنا علم آپ کے سینے میں اتارنے سے چوکتے نہیں۔ انھیں جو کچھ بھی معلوم ہے (اور میں اندازہ نہیں کر سکتا کہ انھیں کتنا معلوم ہے) اسے وہ بے دریغ احباب میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ بسمل صاحب ایک بے تکلف دوست بھی ہیں۔ دوستی میں ان کے ہاں عمر کی قید نہیں ہے۔ استادی اور شاگردی کے رشتے کو بھی وہ دوستی کی ہوا سے محفوظ نہیں رکھتے۔ بے تکلف مذاق، ہزلیہ اشعار ہر چیز کو لطف کے ساتھ سنتے بھی ہیں اور سناتے بھی ہیں۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر شخص کے ساتھ حفظِ مراتب سے پیش آنا ان کی وضع ہے۔ تعارف کے معاملے میں وہ کسی وضع دار انگریز سے کم نہیں جن لوگوں سے متعارف نہ ہوں نہ ان کی باتوں میں دخل دیتے ہیں نہ اپنی گفتگو میں ان کا دخل گوارا کرتے ہیں۔ انھیں بہت کم شعر پسند آتے ہیں لیکن وضع داری کا تقاضہ یہ ہے کہ محفلوں میں معمولی معمولی شعروں کی داد گھٹیا سامعین سے بھی بڑھ کر دیں گے۔ مشاعروں

میں میں نے دیکھا ہے کہ اکثر بسمل صاحب کو ان کے مرتبہ کی بنا پر بالکل آخر میں پڑھوایا جاتا ہے۔ آج کل مشاعروں کا رنگ یہ ہے کہ جس وقت مشاعرہ عین شباب پر ہو اس وقت ہر شاعر یہ چاہتا ہے کہ اسے پڑھوا دیا جائے اور لطف یہ کہ لوگ پڑھ پڑھ کر رخصت ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے بسمل صاحب کو کئی مشاعروں میں اس وقت پڑھتے دیکھا ہے جب اسٹیج پر صاحب صدر اور میر مشاعرہ کے علاوہ صرف بسمل صاحب باقی رہ گئے ہوں لیکن اس کے باوجود کبھی بسمل صاحب کی تیوری پر بل نظر نہیں آئے انھیں کبھی اسٹیج پر بیٹھ کر منتظمینِ مشاعرہ سے شکایت کرتے نہیں دیکھا گیا۔

بسمل صاحب نے یوں تو بہت سی کام کی باتیں بتائی ہیں لیکن ایک بات بڑی کانٹے کی ہے اور اس کا ذکر میں بسمل صاحب کے سلسلے میں بار بار کر چکا ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعری کے لیے تین میم ضروری ہیں۔ پہلا میم ہے مطالعہ دوسرا میم مشق اور تیسرا مشورہ۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ پہلے اور دوسرے میم کی پابندی کے لیے کسی دوسرے آدمی کی ضرورت نہیں لیکن مشورے کے لیے اپنے علاوہ دوسرے آدمی کا ہونا ضروری ہے۔ وہ مشورے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا اصرار یہ نہیں ہے کہ مشورہ انھیں سے لیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ بھی آپ لکھیں اسے منظرِ عام پر لانے سے قبل اپنے کسی سخن فہم دوست یا ساتھی کو بھی دکھا لینا انتہائی ضروری ہے بسا اوقات تخلیق کے جوش میں بعض ایسی اغلاط بھی سرزد ہو سکتی ہیں جن کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ لہٰذا بہت سارے لوگوں کے سامنے شرمندگی اٹھانے سے کہیں بہتر ہے کہ دائی کو پیٹ دکھا لیا جائے۔

بسمل صاحب بعض معاملات میں بہت بدنصیب واقع ہوئے ہیں کچھ معاملات تو اس قدر نجی ہیں کہ ان کا ذکر ہی یہاں بے جا ہے لیکن بعض باتیں یقیناً قابلِ ذکر ہیں۔ بسمل صاحب سے ان گنت لوگوں نے استفادہ کیا ہوگا لیکن محض معدودے چند لوگ ہی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے بسمل صاحب سے کچھ حاصل کیا ہے۔ بعض لوگوں کا شعار میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کوئی تازہ چیز کہیں گے تو سیدھے بھاگے ہوئے اُردو بازار آئیں گے اور بسمل صاحب کو لے کر چپکے سے کسی ایسے چائے خانے میں جا کر بیٹھیں گے جہاں عام طور پر ادیب اور شاعر نہیں جاتے۔ وہاں گھنٹہ بھر تک خوب بسمل صاحب کا دماغ چاٹیں گے یہ لوگ اس شام بسمل صاحب کو چائے کے ساتھ ٹوسٹ اور مکھن بھی پیش

کریں گے اور بسمل صاحب تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے ان کی محبت کے زہر کے ساتھ توسٹ اور مکھن کو بھی حلق سے اتارتے چلے جائیں گے لیکن ایسے لوگوں سے ان کو جو تکدر ہوا کرتا ہے اس کی بھڑاس وہ کچھ گنے چنے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر نکال لیا کرتے ہیں۔

میں نے بسمل صاحب کے کلام کو خوب پڑھا ہے ان کے بے شمار اشعار مجھے یاد ہیں وہ جس دردبست کے ساتھ شعر کہتے ہیں وہ ان کے کلام میں اتنا نمایاں ہے کہ اس پر روشنی ڈالنے کی بھی ضرورت نہیں وہ اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کی کلاسیکی روایات کو خوب اچھی طرح پچایا ہے زبان کی نزاکتوں کو پوری طرح سمجھا ہے۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ غزلیات پر مبنی ہے۔ انھوں نے تنگنائے غزل کو اپنے ایک مخصوص شعری رویّہ کی بنا پر اور بھی تنگ کر لیا ہے جو شاید سہلِ ممتنع سے بھی زیادہ دشوار گزار راستہ ہے۔ میری مراد ان کے ان مخصوص اشعار سے ہے جن کے نمونے کے طور پر یہ ایک شعر حاضر ہے۔

سر جس پہ نہ جھک جائیں اسے در نہیں کہتے
ہر در پہ جو جھک جائے اسے سر نہیں کہتے

جس طرح آدم نے خود اپنی بائیں پسلی سے حوّا کو پیدا کر کے نسلِ انسانی کا سلسلہ آگے بڑھایا ٹھیک اسی طرح بسمل صاحب بھی اس طرح کے بے شمار اشعار میں پہلے مصرع کی بائیں پسلی سے دوسرے مصرعے کو تخلیق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بسمل صاحب کے اس طرح کے اشعار کی مثال حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم میں رکھے ہوئے اس مجسمے سے بھی دی جا سکتی ہے جس میں فنکار نے ایک ہی پتھر میں ایک طرف غرور اور دوسری طرف عجز کے دو مجسموں کو اس طرح تراشا ہے کہ آگے والے مجسمے کی تمکنت اور اکڑ ہی سے پیچھے تراشے گئے مجسمے کے جھکاؤ کا کام لیا گیا ہے۔

بسمل صاحب کے بے شمار اشعار مجھے ازبر ہیں، جی چاہتا تھا کہ ان میں سے وہ شعر جو مجھے بہت پسند ہیں اور جب کسی محفل میں بسمل صاحب کا ذکر آ جائے تو بے ارادہ میری زبان پر آ جاتے ہیں، یہاں درج کروں لیکن ان کی تعداد بھی اتنی ہو جائے گی کہ شاید کئی صفحے گھیر لیں، اس لیے ان میں سے صرف ایک شعر سنا کر رخصت ہوتا ہوں:

یقیں نہ آئے کسی اور کی طرف سے مجھے
اگر سنائے کوئی مجھ کو داستاں میری

۵۳

پریم گوپال متّل

بسمل صاحب

مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں کہ بسمل سعیدی صاحب سے میں پہلی بار کب ملا تھا اور کس طرح ملا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ ان دنوں میں پانچویں کلاس کا طالب علم تھا۔ میرا اسکول صدر بازار میں واقع تھا اور میں رہتا ڈپٹی گنج میں تھا جو صدر بازار کے قریب ہی دلّی کا ایک پرانا محلّہ ہے۔ بسمل صاحب ڈپٹی گنج سے کچھ دوری پر باڑا ہندو راؤ میں رہتے تھے اور اب بھی وہیں رہتے ہیں۔ کئی بار اسکول سے آتے ہوئے یا گھر سے اسکول جاتے ہوئے راستے میں بسمل صاحب سے آمنا سامنا ہو جاتا۔ میں بڑھ کر آداب کرتا اور وہ بڑے پیار سے مجھے سینے سے لگا لیتے اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دیتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میرے ہم جماعت یہ دیکھتے یا سنتے تھے تو ان کی نگاہ میں میرا درجہ بڑھ جاتا تھا۔ بڑی جماعتوں کے کئی لڑکے بھی مجھ سے دوستی کی حد تک مانوس ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ بسمل صاحب مجھے میرے والدِ محترم گوپال متّل صاحب کے بڑے لڑکے کی حیثیت سے جانتے پہچانتے تھے۔ کہتے ہیں کہ انھی دنوں لال قلعے کے جشنِ جمہوریت کے مشاعرے میں گوپال متّل صاحب نے جوش ملیح آبادی صاحب کی کسی نظم کے جواب میں کچھ رباعیاں پڑھ کر مشاعرہ لوٹ لیا تھا جس کا ہر طرف چرچا تھا۔ اس مشاعرے کے تذکروں نے بھی مجھے پورے اسکول میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا حالانکہ اس میں میرا کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ بسمل صاحب کی محبت اور شفقت پا کر میں خود بھی خوش ہوتا تھا اور میری حیثیت خود میری نظر میں بھی بڑھ جاتی تھی۔ گیارہویں جماعت تک یعنی جب تک میں اسکول میں رہا، یہ سلسلہ جاری رہا۔ اُن دنوں یہ رواج تھا کہ جب اسکول سے رخصت ہونے والے طلبا کو الوداعی پارٹی دی جاتی تو گیارہویں کلاس کے جونیئر اپنے سینیئرز میں سے کچھ کو کوئی نہ کوئی تحفہ دیا کرتے

تھے اور NICK NAME بھی ـــــ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ تحفہ پانے والے کی شخصیت کی کچھ جھلک بھی NICK NAME میں آ جائے۔ جب میرا نام پکارا گیا اور میں مائک پر پہنچا تو مجھے ایک خوشنما ڈائری دی گئی اور کہا گیا کہ میں اس میں اچھے اچھے شعر نوٹ کیا کروں۔

انھی دنوں کی بات ہے کہ میں پاڑا ہندو راؤ، بغیچی اچھے جی میں اپنے ایک دوست احمد سے ملنے گیا۔ وہ مجھ سے سینیر تھے۔ ان کا مکان بسمل صاحب کے مکان کے قریب ہی تھا لیکن انھوں نے اب تک بسمل صاحب کو دور دور ہی سے دیکھا تھا۔ احمد نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ کیا تم بسمل صاحب کو جانتے ہو؟ میرے ہاں کہنے پر احمد بولے کہ اگر تم مجھے بسمل صاحب سے ملوا دو تو میں تمھیں پارٹی دوں۔ میں انھیں لے کر بسمل صاحب کی خدمت میں پہنچ گیا۔ بسمل صاحب ہمیشہ کی طرح بہت محبت سے ملے اور احمد سے بھی اسی شفقت کے ساتھ پیش آئے۔ احمد نے حسب وعدہ پارٹی دی جس میں اور بھی کئی دوست شریک ہوئے۔

پھر بسمل صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ منقطع سا ہو گیا۔ میں نے غازی آباد کے ایک کالج میں داخلہ لے لیا تھا جہاں پہنچنے کے لیے مجھے بہت صبح گھر سے نکلنا پڑتا تھا۔ لیکن بسمل صاحب کی محبت کا نقش اُن دنوں بھی دل میں تازہ رہا۔

ایم۔ اے۔ کر لینے کے بعد جب میں نے آفس جوائن کیا تو بسمل صاحب سے پھر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ چار چھ مہینے میں ایک دو بار وہ "تحریک" کے دفتر میں ضرور آنکلتے۔ دفتر میں متّل صاحب موجود ہوتے تو ان کی گفتگو زیادہ تر متّل صاحب ہی سے رہتی لیکن بیچ بیچ میں وہ مجھے بھی مخاطب کر لیتے اور کوئی نہ کوئی بات ایسی کہتے کہ میں ہنس پڑوں۔ میں ان کی نظر میں اب بھی پانچویں کلاس کے بچے ہی کی طرح تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر اسی طرح خوش ہوتے، اسی طرح میری پیٹھ تھپتھپاتے اور صحت و ترقی کی دعائیں دیتے۔ بسمل صاحب کے اس رویے میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ بسمل صاحب تشریف لائے اور دفتر میں متّل صاحب موجود نہیں ہیں۔ بسمل صاحب پھر بھی بیٹھ گئے اور دیر تک مجھ سے اور مخمور صاحب سے باتیں کرتے رہے۔ میں نے چائے کے لیے پوچھا تو ہنس کر کہیں گے: ہاں پریم جی! ضرور پئیں گے، شرط یہ ہے کہ آپ اپنے ہاتھ سے بنا کر پلائیں اور ساتھ کچھ کھلائیں بھی۔ کھانے پینے کی چیزیں آجائیں گی

تو خود کم کھائیں گے، مجھے زیادہ کھلانا چاہیں گے، مخمور صاحب سے بھی بار بار کہیں گے کہ لو، یہ لو یہ کھاؤ۔

جب میں نے اپنے چھوٹے بھائی کرشن گوپال کے ساتھ مل کر اپنا پبلشنگ ہاؤس پی۔ کے۔ پبلی کیشنز قائم کیا تو اور کتابوں کے علاوہ بسمل سعیدی صاحب کا مجموعہ "اوراقِ زندگی" بھی شائع کیا جس میں اُن کے پچھلے تینوں مجموعوں کے انتخاب کے علاوہ ان کا نیا کلام بھی شامل تھا۔ اسے مخمور سعیدی صاحب نے مرتب کیا ہے اور اس وقت بسمل صاحب کا صرف یہی مجموعہ دستیاب ہے۔

بسمل صاحب کی زندگی میں بہت سے غم ہیں، پھر بھی وہ مجھ سے جب بھی ملے انھوں نے بظاہر ایسی باتیں کیں جو ہنسنے ہنسانے کے لیے ہوں لیکن میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ ان باتوں کے پیچھے مجھے کچھ سکھانے، میرے علم میں کچھ اضافہ کرنے کی مشفقانہ خواہش بھی کام کر رہی ہے۔ وہ جیسے زندگی کرنے کے کچھ خاص آداب سے مجھے آشنا کرنا چاہتے ہوں۔ انھیں میری ذہنی تربیت کی فکر ہو لیکن اس طور پہ کہ میں اسے محو [illegible] کرسکوں۔ جب وہ کوئی سبق آموز بات کہنا چاہیں تو پہلے کوئی دلچسپ تمہید قائم کریں گے اور کافی گھماؤ پھراؤ کے بعد اصل نکتے پر آئیں گے، پھر فوراً ہی بات کا رخ بدل دیں گے۔ سننے والے نے سمجھ لیا تو اس کی خوش توفیقی اور سعادت ورنہ پندِ پیرِ دانا سے محرومی اس کا مقدر ٹھہرے گی۔

بسمل صاحب بزرگ ہیں لیکن چھوٹوں سے بھی ہم عمروں کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔ اگر آپ ان کے سامنے بہت مؤدب بنے بیٹھے ہیں، احتراماً خاموش ہیں، نہ گفتگو میں حصہ لے رہے ہیں، نہ کسی بات پر اپنا ردِ عمل ظاہر کر رہے ہیں تو وہ آپ کو مخاطب کرکے اچانک کوئی ایسی بات کہیں گے کہ آپ کا یہ خود ساختہ حصار ٹوٹ جائے گا اور آپ اسی فضا کا حصہ بن جائیں گے جس میں بسمل صاحب آپ کے سامنے بے تکلفانہ گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی اس بے تکلفی میں بھی تکلف کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں جنھیں وہ ملحوظ رکھتے ہیں۔ حفظِ مراتب کا جیسا پاس بسمل صاحب کو ہے، میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے۔

بسمل صاحب، منتل صاحب کے دوستوں میں ہیں لیکن میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ میرے دوست نہیں ہیں۔ ان کا رویہ محض بزرگانہ کبھی نہیں رہا اور ان کی غیر موجودگی میں جب بھی ان کا خیال آتا ہے ایک شفیق دوست کا چہرہ نظروں میں پھرنے لگتا ہے جس کی آنکھوں میں بزرگانہ شفقت ہے تو ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ۔

قیمتِ عرضِ ہنر

بسملؔ جو کہیں دیکھتے قدر اپنے ہنر کی
کرتے ہم ابھی عرضِ ہنر اور زیادہ

(ڈاکٹر) یوسف حسین خاں

بسمل سعیدی کی غزل

بسمل سعیدی موجودہ دور میں اردو غزل کے مانے ہوئے استاد ہیں۔ ان کا انداز بیان کلاسیکی روایات میں رچا ہوا ہے۔ زبان میں سادگی اور طرز ادا میں استادانہ پختگی ہے۔ ویسے لکھنے کو وہ غزل، نظم، رباعی سب اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ غزل کے شاعر ہیں اگرچہ وہ خود صاحب طرز ہیں لیکن ان کا کلام پڑھتے وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان کے تغزل کا لب و لہجہ جگر مراد آبادی کے تغزل سے مماثلت رکھتا ہے۔ جگر کی طرح بسمل سعیدی بھی خالص جذبے کے شاعر ہیں۔ حسرت موہانی بھی جذبے کے شاعر ہیں لیکن حسرت کا جذبہ جگر اور بسمل سعیدی کے جذبے سے مختلف ہے۔ حسرت کا جذبہ سادہ، مفرد اور یک رخا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ اپنے مقصود منتہا کی طرف بلا تامل سیدھا چلا جاتا ہے۔ اسے اپنی خواہش کی صداقت، قوت اور واقعیت پر کبھی شبہ نہیں پیدا ہوتا۔ اسی لیے حسرت کا بیان احساس کی طرح ہمیشہ صاف اور واضح ہوتا ہے۔ اس میں نہ اینچ پیچ ہے اور نہ تامل اور جھجک۔ اس کے برعکس جگر اور بسمل سعیدی کا جذبہ پیچیدہ اور الجھا ہوا ہے۔ اس کی زیریں تہوں میں نئے نئے شگوفے برابر کھلتے رہتے ہیں جن پر عقل اور ارادے کو کوئی قابو نہیں ہوتا۔ یہ زیریں لہریں بعض اوقات اتنی قوی اور متحرک ہو جاتی ہیں کہ خود اصلی جذبہ ان میں چھپ جاتا ہے۔ لیکن وہ دب کر پھر ابھرتا اور شعوری زندگی پر چھا جاتا ہے۔ جگر اور بسمل سعیدی کے جذبے کو یہ مبہم سا احساس ہوتا ہے کہ اس کی منزلِ مقصود کیا ہے اور کدھر ہے؟ بایں ہمہ وہ اپنے وجود سے الجھتا ہے اور اس کھینچا تانی میں کبھی کبھی منزل کا راستہ بھی بھول جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ فنکار جب اپنے آپ سے الجھتا ہے تو عظیم فن جنم لیتا ہے۔ لیکن اسی الجھاؤ کے باعث جذبے کو یہ شکایت پیدا ہو جاتی ہے کہ زبان و بیان اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں جگر کی طرح بسمل سعیدی

کے کلام میں بھی ندائیہ اور فجائیہ کلمات (انٹرجیکشنز) کی کثرت کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ جذبے کا ابھار اپنے اظہار و ابلاغ کے لیے زبان و بیان کی رکاوٹ پر قابو پانے کے لیے ندائیہ اور فجائیہ کلمات کا سہارا لیتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

خوشا یہ آتشِ عشق، آدمی کا ذکر تو کیا　　فرشتے جلتے ہیں جس میں یہ وہ جہنم ہے
زہے یہ وقت کہ بسمل بقول ناظم کے　　اب آفتاب سے اونچا مقامِ شبنم ہے

○

شدتِ شوق کا اللہ رے فسوں اُف رے فریب　　اُن کی نفرت پہ محبت کا گماں ہوتا ہے
ان سے اس طرح جدا ہو کے ہم آئے ہیں کہ ہائے　　آنکھ سے جیسے کوئی اشک رواں ہوتا ہے
ہائے اس عشق میں انساں کا جواں مر جانا　　جیسے کم بخت اسی دن کو جواں ہوتا ہے
عشق میں ہائے طبیعت کا وہ عالم بسمل　　عالمِ عشق بھی جب دل پہ گراں ہوتا ہے

○

ان کا در چھوڑ کے اوننگِ محبت، اور شک　　ارے کم بخت یہ سجدے جو پریشاں ہوں گے

○

خوشا عالمِ رنگ و شادابیِ حُسن　　شرابور ہو جیسے پھولوں کے رس میں

○

وہ کریں جو معذرتِ ستم تو خوشا نصیب، زہے کرم
نہ بھلا سکیں گے مگر وہ ہم جو گزر گئی دلِ زار پر

○

محبت، اے معاذ اللہ محبت، دم نکل جائے　　اگر محسوس بھی اتنی ہو جتنی دل میں ہوتی ہے

مندرجہ بالا شعر بسمل سعیدی کے نشتروں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ انھوں نے ندائیہ اور فجائیہ انداز میں میرے اس دعوے کی تائید کی ہے کہ ان کے دل میں جو جذبات اٹھتے ہیں وہ پورے کے پورے معرضِ بیان میں نہیں آتے، نہ صرف یہ کہ معرضِ بیان میں نہیں آتے بلکہ پوری طرح محسوس بھی نہیں ہوتے۔ انھیں مبہم طور پر یہ احساس ضرور رہتا ہے کہ ان کے دل میں محبت بے حد اور بے پناہ ہے لیکن حقیقت میں وہ جتنی ہے اتنی محسوس نہیں ہوتی۔ جب احساس کا عجز ہے تو لازمی طور پہ بیان کا عجز بھی ہو گا۔ لیکن اس کے باوجود محبت

کی حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے۔ شاعر کو اس پر ویسا ہی ایمان ہوتا ہے جیسا کہ خود اپنے وجود پر یا محبوب کے حسن پر۔ یہ جذبے اور احساس کی بڑی الجھی ہوئی کیفیت ہے جو بے نام ہونے کے باوجود حقیقی ہے۔ تخلیقی فن کار کو جب اس سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ ندائیہ اور فجائیہ کلمات سے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرتا ہے۔ بسمل سعیدی نے دوسری جگہ اپنے عجزِ بیان کا اس طرح اعتراف کیا ہے:

عشق ہوتا ہے دل کا اک عالم   دل کا عالم بیاں نہیں ہوتا

عبدالرحیم خان خاناں کا اسی مضمون کا بے مثل شعر ہے جس میں اس نے اپنے عجزِ احساس کو تسلیم کیا ہے:

شمارِ شوق ندانستہ ام کہ تا چند است   جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزو مند است

بسمل سعیدی محبوب کی آستین سے، و اشک پونچھنے کو دمِ واپسیں سے بھی الجھنے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ یہ ان کے جذبے کی دائمی کیفیت ہے۔ یہ الجھاؤ ان کی فنی تخلیق کو ابھارتے ہیں:

کب سے الجھ رہے ہیں دمِ واپسیں سے ہم   وہ اشک پونچھنے کو تری آستیں سے ہم

چند اور اشعار ملاحظہ طلب ہیں جن میں ندائیہ اور فجائیہ کلمات استعمال ہوئے ہیں شاعر کو دشتِ جنوں میں بھی الجھنے کے لیے در و دیوار نظر آتے ہیں، چاہے وہ موہوم ہی کیوں نہ ہوں۔

وائے بیدادِ جنوں، دشت میں دیوانے کو   ہر طرف کچھ در و دیوار نظر آتے ہیں

O

رخصت اے چاکِ گریباں، دستِ وحشت الوداع
بڑھ چکے ہیں اب جنوں کی حد سے دیوانے بہت

O

تری نگاہ کی شوق آفرینیاں، توبہ   جو کامیاب ہے وہ بھی تو کامیاب نہیں

O

معاذ اللہ شیخ و برہمن کا ظاہر و باطن   گناہوں نے پہن رکھا ہے جامہ پارسائی کا

O

کیا دیکھتا ہے اے دلِ مشتاقِ دید اب — ہم نے تو کہہ دیا تھا، خبردار، دیکھ کر

○

جو تیرے غم پہ لٹا دوں نہ ہر خوشی اپنی — خدا کرے مجھے کوئی خوشی نصیب نہ ہو

○

خدا کرے کبھی بے اختیار یاد آؤں — خدا کرے کبھی بے اختیار یاد کرو

○

گناہِ شوق کی توفیق دے خدائے عشق — خدائے عشق! دہائی تری دہائی ہے

بسمل سعیدی کے تغزل کی دوسری اہم خصوصیت جس نے مجھے متاثر کیا وہ قولِ محال (پیراڈاکس) کا استعمال ہے۔ اگرچہ یہ خصوصیت اُردو زبان کے دوسرے غزل نگاروں کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن میرے خیال میں بسمل سعیدی نے جس کثرت اور تواتر سے اسے برتا ہے اس کی مثال میرے علم میں نہیں۔ قولِ محال سے بھی فن کار کی جذباتی زندگی کے الجھاؤ ظاہر ہوتے ہیں۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے جو اثبات کا دعویٰ کیا وہ خود اس کی تردید کر رہا ہے یا اس کی ضد پیش کر رہا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس طرح وہ اپنے جذبے کی پیچیدگی کو ظاہر کرتا ہے جو کبھی اشتباہ اور کبھی استعجاب کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ جگر کے یہاں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ بسمل سعیدی کے کلام میں کثرت سے اس کے نمونے بکھرے ہوئے ہیں یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

محبت ہی مرے ہر کام کو مشکل بناتی ہے — محبت ہی سے ہر مشکل کو آساں کر رہا ہوں میں

○

جب وہ ہوتے ہیں تو ہر شے جیسے ہو جاتی ہے گم
وہ نہیں ہوتے تو ہر شے میں انھیں پاتا ہوں

○

جب التفات نہ تھا اشتیاق رہتا تھا — اب التفات ہوا ہے تو دل کو تاب نہیں

○

محبت ہی ہزاروں مدعاؤں سے عبارت ہے
محبت ہی مگر ہے بے نیازِ مدعا رہنا

تمھاری بے نیازی ہی نے مجھ کو بھی سکھایا ہے
تمھارے پاس ہی رہنا مگر تم سے جدا رہنا

O

عبادتوں کے لیے فرصتیں ہیں لوگوں کو
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

O

وسعتیں عشق کی محدود ہوئی جاتی ہیں
آرزو ہے کہ ابھی کم نہیں ہونے پاتی

O

دست و دامن میں نہ ہو جیسے کوئی وابستگی
میرے دستِ شوق سے دامن چھڑانا دیکھیے

O

فصلِ گُل کو جس قدر برباد کرتی ہے خزاں
باغ میں اتنا ہی بڑھ جاتا ہے امکانِ بہار

O

میں بے نیاز سہی تم سے بھی محبت میں
مگر تمھاری محبت سے بے نیاز نہیں

O

دیکھ سکتا ہی نہیں اوّل تو میں ان کی طرف
دیکھ لیتا ہوں تو پھر دیکھے چلا جاتا ہوں میں

O

اگر یہ سجدے ہیں ممنونِ آستاں لیکن
مذاقِ سجدہ مجھے آستاں سے پہلے تھا

O

عشق نومید تو نہیں لیکن
عشق امید پر نہیں ہوتا

O

خرابِ عشق ہونا غایتِ مفہومِ ہستی ہے
وہ دل آباد ہو جاتا ہے جو برباد ہوتا ہے

O

وہی زمین، وہی آسمان ہے لیکن
نہ وہ زمین، نہ وہ آسمان ہے گویا

بسمل سعیدی کے یہاں عشق و محبت کی نفسیات کم و بیش وہی ہے جو اُردو کے کلاسیکی ادب کی خصوصیت ہے۔ وہ حسن اور عشق دونوں کا احترام کرتے اور دونوں کے حقوق کو مانتے ہیں۔ ان کے کلام میں محبت کے موضوع پر بعض اعلیٰ درجے کے اشعار موجود ہیں جن میں خود ان کا

رنگ و آہنگ نمایاں ہے۔ اس میں سپردگی اور ربودگی کے ساتھ عزتِ نفس کا احساس موجود ہے۔ لہجے میں نرمی اور نزاکت بھی ہے اور مردانہ پن بھی۔ تخئیل اور جذبہ ایسے شیروشکر ہیں کہ ان کی دوئی باقی نہیں رہی۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ ان کی دلی واردات اور ذاتی تجربوں کا بیان ہوتا ہے سُنی سنائی باتیں نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض اشعار عرصہ تک دل و دماغ پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

وہ میری وفاؤں پہ عائد ہوئے ہیں — جو الزام ان کے ستم پر نہیں ہیں

○

نہ التفات کی خواہش نہ بے رخی کا ملال — ہم اُن کی بزم میں بیگانہ وار بیٹھے ہیں

○

ٹھہرنے بھی نہیں دیتی ہے اس محفل میں بیتابی
مگر تسکین بھی جا کر اسی محفل میں ہوتی ہے

○

اب حُسن سے بھی ہے عشق بیزار — دیوانے کی کس سے دوستی ہے

○

ہمیں ان کی طرح منظور خود بینی نہیں ورنہ — محبّت حُسن سے بڑھ کر حسیں ہے اپنی فطرت میں

○

عشقِ گستاخ کی شہ پر ترا خواہاں ہو کر — دل دھڑکتا ہے لرزتا ہوا ارماں ہو کر

○

کیا جذب ہو رہا ہوں میں جلووں میں حُسن کے
اب عشق ساتھ چھوڑ رہا ہے یہاں سے کیا

کتنا بلند عشق کی غیرت نے کر دیا ـــــ جس دن سے گر گئے ہیں تمھاری نظر سے ہم
مزہ تو جب ہے کہ مجبورِ آرزو ہو جائے ـــــ ترا کرم مرے دامانِ آرزو کے لیے
بقدرِ عشق نہیں ہے اگرچہ میری وفا ـــــ مگر جفا سے تری شرمسار بھی تو نہیں
کیوں کر امکانِ محبّت کی حدیں توڑ سکے ـــــ کس طرح چاہے کوئی حسبِ تمنّا تم کو

●●

رشید حسن خاں

شاعری اور مرقّع سازی

دہلی میں مولوی سمیع اللہ مرحوم، اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ کتب خانۂ عزیزیہ، مولوی صاحب کی دکان کا نام تھا (اب بھی ہے) یہاں کتابوں کا کاروبار کم ہوتا تھا، انجمن آرائی زیادہ ہوا کرتی تھی۔ دکان کے باہر مولوی صاحب ہی کی طرح ایک سال خوردہ بنچ پڑی رہتی تھی، شاید ایک آدھ تپائی بھی۔ دکان کے اندر معمولی سا فرش۔ شام کو یہ کتاب خانہ، ادیبوں، شاعروں اور زندہ دل بزرگوں کا مرکز سا معلوم ہوتا تھا۔ مولوی صاحب ہی کی طرح کچھ اور وضع دار لوگ تھے جو ہر طرح کی نرمی و گرمی کے خوگر تھے، اور یہ گویا یہاں کے مستقل آنے والوں میں سے تھے۔ کوئی یہاں بیٹھا ہے، کوئی وہاں۔ شام کے سایے جب گہرے ہو جاتے تھے تو یہاں کبھی کبھی محفلِ خاص جمتی تھی اور دلی کی "بامحاورہ زبان" بھی سننے کو مل جاتی تھی۔ یہاں علمائے کرام بھی تشریف فرما ہوتے تھے، مگر مولوی صاحب کی قلندری اور اس کتاب خانے کی فضائے باصفا کی یہ برکت تھی کہ یہ حضرات بھی رکھ رکھاؤ سے بے نیاز ہو کر بیٹھتے تھے اور دوسرے زندہ دل لوگوں کی طرح شریکِ عشرتِ محفل نظر آتے تھے۔

میں ۱۹۵۹ء میں بسلسلۂ ملازمت یہاں آیا تھا۔ مولوی صاحب مرحوم کی شفقت نے مجھے بھی حاضری دینے والوں کی صف میں شامل ہونے کا شرف بخش دیا تھا۔ یہیں بسمل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بہت جلد تکلف کے پردے اٹھ گئے، اور میری خوے کم آمیزی کچھ بھی کام نہ آئی۔ بسمل صاحب محفل آرائی اور دوست نوازی کے آداب سے واقف بلکہ ماہر ہیں، لطیفے سنانے، پھبتی کسنے اور جملے چست کرنے میں طاق، اچھے شعر سننے کے مشتاق اور بہت اچھے شعر سنانے کے شائق؛ پھر بھلا تکلفات کو قیام و قرار کے لیے جگہ کہاں ملتی اور کیسے ملتی۔ شروع شروع میں کئی سال تک یہ حال رہا کہ ہفتے میں دو چار بار ضرور ملاقات ہوتی تھی۔ لطائف و ظرائف کے

علاوہ، شعروشاعری یا اُس کے متعلقات، گفتگو کا خاص موضوع ہوتے تھے۔ اِن ملاقاتوں میں بسمل صاحب کے مزاج اور اندازِ فکر کو بہت کچھ سمجھنے کا موقع ملا۔

پسندیدہ اشعار سے آدمی کے ذوق اور نظر کا بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ میں بلا شائبۂ تکلف کہہ سکتا ہوں کہ بسمل صاحب اس معاملے میں باذوق بھی ہیں اور صاحبِ نظر بھی۔ شعر میں ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر کا ہو اور حُسنِ بیان میں ذرا سی بھی کمی ہو تو بسمل صاحب کا ذوق ایسے شعر کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوگا۔ اِس سلسلے میں اُن سے اختلاف بھی کیا جاتا تھا، بحث ہوتی تھی، تکرار کی نوبت بھی آجاتی تھی، مگر بسمل صاحب نہیں مانتے تھے۔ بعض دفعہ تو وہ ایسے اشعار لکھنے والے پر تبرّا بھیجنے میں بھی تکلف نہیں کرتے تھے۔ شعرگوئی کی طرح، اس فن میں بھی بسمل صاحب کو درجۂ استادی حاصل ہے۔ منطق یہ ہوتی تھی کہ اگر کوئی شخص اِس قدر بڑا شعر کہہ سکتا ہے تو کیا ہم اسے اتنا سا بُرا بھی نہیں کہہ سکتے!

جدید شاعری سے بسمل صاحب ہمیشہ ناخوش رہے، پھر جدید شاعروں سے کیسے خوش رہ سکتے تھے۔ میں کبھی کبھی محض لطفِ سخن کی خاطر ایسے کسی شاعر کی تعریف کر دیتا۔ بسمل صاحب کے چہرے پر مجلسِ عزا والی کیفیت چھا جاتی تھی، آنکھوں میں حقارت کی بجلیاں کوندنے لگتی تھیں اور اس عالم میں شہرآشوب کے ایسے ایسے بند سننے میں آتے تھے کہ واہ واہ اور سبحان اللہ! مخمور سعیدی ان کے عزیز ترین شاگرد ہیں۔ مخمور کی ذہانت اور صلاحیتِ شعرگوئی کے وہ معترف ہیں، مگر یہ بھی کہتے رہتے ہیں کہ ہائے، ان آبائی شاعروں کا ساتھ انھیں گم راہ کیے دے رہا ہے، افسوس! اس سلسلے میں مجھ سے بہ طورِ خاص شکوہ کیا کرتے ہیں۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ میں زبان اور قواعدِ شاعری کے سلسلے میں غلط آزادہ روی کا مبلغ ہوں۔ مگر یہ باتیں کہتے ہیں ایسے دردناک خلوص کے ساتھ، اور اس قدر مہذب پیرایے میں، کہ تردید کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی——
بسمل صاحب کے مزاج اور اندازِ فکر کا کچھ اندازہ آپ نے کرلیا ہوگا۔

بسمل صاحب کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو صاف صاف معلوم ہوگا کہ انھوں نے کلاسکی طرز اور مقررہ ادب آداب کی سختی کے ساتھ پابندی کی ہے۔ زبان کی صحت، بیان کی خوبی، الفاظ کا برمحل استعمال اور لفظی مناسبتوں کا لحاظ رکھنا، اُن کی شاعری کے نمایاں خارجی محاسن ہیں۔ احساس کی گرمی اور جذبے کی شدت اُن کے اکثر اچھے اشعار میں رواں دواں محسوس ہوتی ہے، مگر اُن کا خاص انداز یہ ہے کہ وہ لفظی مناسبتوں کے ساتھ اس کو معرضِ اظہار میں لاتے ہیں۔ حُسنِ تکرار،

مراعات النظیر اور صنعتِ تضاد کی اچھی مثالیں اُن کے کلام میں ملتی ہیں۔ غزلوں کے کم اچھے شعر ہوں گے جن میں ان کی نمود نہ ہو مگر وہ لفظ پرست نہیں، لفظ شناس ہیں۔ شاعری میں صنعت گری کے قائل نہیں، صناعتِ شعری میں مہارت رکھتے ہیں، اور یہ اُن کا مزاج اور انداز خاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اہتمام، مفہوم پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوتا کہ اس کی حیثیت ثانوی ہو جائے۔ مشاقی اور قدرتِ کلام کا یہ عالم ہے کہ اکثر صورتوں میں ایسے لفظی تناسبات کی طرف بڑھنے والے کا ذہن منتقل بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً ان اشعار کو دیکھیے:

ہنس، تم آج روتے ہو انجامِ عشق کو　　ہم کل سمجھ گئے تھے، کچھ آثار دیکھ کر

○

واہ رے بیدادِ جنوں، دشت میں دیوانے کو　　ہر طرف کچھ در و دیوار نظر آتے ہیں

○

سننے والے ہی پہ ہے منحصر اندازۂ غم　　ورنہ جو حال ہے نہ کس سے بیاں ہوتا ہے

○

وہ مجھ کو دیکھ کر کچھ اس طرح منہ پھیر لیتے ہیں　　کہ جیسے میری حالت واقعی دیکھی نہیں جاتی

پہلے دونوں اشعار میں بالترتیب صنعتِ تضاد اور مراعات النظیر موجود ہے، آخری دونوں شعروں میں لفظی تناسب کا اس طرح وجود نہیں پایا جاتا مگر چاروں شعر مفہوم اور بیان دونوں کے لحاظ سے یکساں نظر آتے ہیں۔ بیان کی سادگی اور مفہوم کی پُرکاری چاروں شعروں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ بات پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ داغ کے اثر سے غزل میں لطفِ زبان اور محاوروں کے برجستہ استعمال کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ دوسری طرف وہ اربابِ علم و فضل تھے جو لطفِ زبان کے علاوہ، لفظی مناسبات کو بہت کچھ سمجھتے تھے۔ ٹونک کے دربار میں ایک طرف تو مضطر خیرآبادی تھے جن کا سرمایۂ کمال وہی لطفِ زبان تھا۔ یہ داغ کی روایت کی گویا توسیع تھی اور دوسری طرف بہت سے وہ لوگ تھے جو عربی فارسی کے عالم تھے اور علمی اندازِ نظر کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اُردو کے مختلف اہم مرکزوں میں عموماً یہی صورتِ حال پائی جاتی تھی (بہ استثنائے دہلی، یہ استثنا طویل بحث کا متقاضی ہے، اس لیے اس پر پھر کبھی گفتگو کی جائے گی) ان لوگوں سے داد حاصل کرنا واقعی مشکل تھا، اور ان لوگوں کی پسندیدگی کے بغیر اعتبار کی سند ملنا مشکل تر۔ یہ لوگ لفظوں کے

یارکھ اور صنائع کے خوگر ہوا کرتے تھے۔ جب تک شعر میں مناسبات کا التزام نہ ہو، یعنی جو خاص لفظ یا الفاظ جانِ شعر کی حیثیت سے آئیں، ان کو دوسرے بعض لفظوں سے کچھ نہ کچھ نسبتِ خاص نہ ہو، اس وقت تک شعر کو پسندیدگی کا شرف حاصل نہیں ہو پاتا تھا۔ بسمل صاحب خود علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم اسی نہج پر ہوئی، اور اسی علمی و شعری ماحول میں شعرگوئی کا آغاز و ارتقا ہوا! غالباً یہی وجہ ہے کہ لفظی مناسبات کا اہتمام اُن کے مزاج کا جز اور انداز کا حصہ ہے اور صحتِ زبان و بیان پر اصرار اور انتہاپسندی کی حد تک اصرار بھی اسی کی دین ہے۔

میں اس کی صراحت کرنا چاہتا ہوں کہ عموماً لفظی مناسبات پر اُن کے اشعار کی بنیاد نہیں ہوتی۔ ان کا انداز یہ ہے کہ وہ مفہوم کو لفظی مناسبات کی مدد سے ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے اکثر اچھے اشعار میں یہ اہتمام نظر آتا ہے، اور وہ اس سلسلے میں صنعتِ تضاد، لف و نشر اور مراعات النظیر سے اکثر کام لیتے ہیں، مثلاً :

اب آنسوؤں نے حقیقت بیان کی اُس کی   جو قہقہوں کی زباں پر کبھی فسانہ تھا

○

اِس زندگی کو عشرتِ امروز چاہیے   مجھ سے تو روز وعدۂ فردا کرے کوئی

○

حد بھی کوئی انتظار کی ہے   اب چاندنی، دھوپ ہو چلی ہے

○

اس محبت، اس جوانی کی قسم   پھر نہ یہ نیندیں، نہ یہ بیداریاں

○

حسنِ غارت گر سے کیا بچتی متاعِ آرزو   عشق کی ناکامیاں ہی کچھ نگہباں ہو گئیں

تکرارِ الفاظ بھی اُن کے پیرایۂ بیان کی ایک خصوصیت ہے۔ یہ خاصا مشکل اور خطرناک انداز ہے۔ یہاں مشاقی کے کمال کی آزمائش ہوتی ہے۔ خالص صنعت گری کی نمود بھی اس پھیر میں بڑی آسانی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس التزام کے ساتھ بسمل صاحب نے اچھے اچھے شعر کہے ہیں۔ وہ اس سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ لفظوں اور ٹکڑوں کو مکرر لاتے ہیں کہ حسنِ ادا کا رنگ چمک اٹھتا ہے، مثلاً :

مجھ کو ہر ظلم گوارا ہے تمھارا، لیکن   یہ گوارا نہیں، کہتی ہے جو دنیا تم کو

○

جوانی کا عالم ہے کچھ ہی نفس کا — مگر ایک عالم ہے اک اک نفس میں

○

وہ ہر ادا میں عرضِ تمنا سے بے نیاز — میں ہر نظر میں عرضِ تمنا لیے ہوئے

اسی انداز کی ایک صورت اور ہے جس میں تکرار تو ایک دو لفظوں کی ہوتی ہے، مگر بیان میں کچھ ایسا پیچ ہوتا ہے کہ استعجاب کا عجیب عالم پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایک طرح کے قولِ محال والا لطف آ جاتا ہے اور کبھی حسنِ تعلیل کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے، مثلاً :

وہ ردِ راہِ محبت کون سی منزل میں ہے — دل ہے بیزارِ محبت، اور محبت دل میں ہے

○

دل بن سکا نہ درد کو پیدا کیے بغیر — پیدا ہوا نہ درد، تمنا کیے بغیر

○

تیری محفل کے سوا تو کوئی عالم ہی نہیں — وہ کہیں کا نہ رہا، جو تری محفل سے اُٹھا

○

وہ عشق ہے، جو دل کو گوارا کبھی نہ ہو — اور دل رہے نہ جس کو گوارا کیے بغیر

تکرارِ الفاظ کی جو صنعت ہے اور لفظی مناسبات کا جو التزام ہے، ذرا سی غفلت سے، ان کی وجہ سے شعر محض لفظی اُلٹ پھیر کا مجموعہ اور صرف کرشمۂ استادی کا مظہر بھی بن جایا کرتا ہے۔ بسمل صاحب اس غفلت کا شکار کم ہوئے ہیں، مگر ہوئے ہیں، جیسے :

تم جب آتے ہو، تو جانے کے لیے آتے ہو — اب جو آکر تمھیں جانا ہو، تو آنا بھی نہیں

○

محبت کا عالم کبھی کچھ، کبھی کچھ — دلِ شاد و ناشاد ہے اور میں ہوں

چمن ہے، تری یاد ہے، اور میں ہوں — صنوبر ہے، شمشاد ہے اور میں ہوں

غزل کا جو دائرۂ خاص ہے، یعنی عشقیہ شاعری، بسمل صاحب اُس دائرے کے مسند نشینوں میں سے ہیں۔ اُنھوں نے واقعہ یہ ہے کہ اچھے اچھے شعر کہے ہیں۔ ان اچھے اشعار میں کہیں جذبے اور احساس کی تہ داری ہے، کہیں واردات کی عکاسی ہے اور کہیں عرضِ تمنا کا وہ عالم، جس کے بعد اور کوئی عالم گویا رہتا ہی نہیں۔ لطفِ زبان اور حسنِ بیان ایسے سب اشعار کا پیرایہ ہے۔ اب ایسے کتنے شاعر ہیں جو کلاسکی طرز میں اُس اہتمام اور التزام کے ساتھ جس کا ذکر کیا گیا

ہے ایسے دل میں اُتر جانے والے شعر کہتے ہوں :

بہار کیا ہے، چمن کی اک آرزوئے طرب　　خزاں، چمن کی اُسی آرزو کا ماتم ہے

○

کچھ اِس ادا سے جھپکتے ہیں وہ پلک بسمل　　کسی کے ہونٹ ہلیں جیسے گفتگو کے لیے

○

اب عشق رہا، نہ وہ جنوں ہے　　طوفان کے بعد کا سکوں ہے

○

ہیں وہ دشمن کے، تو ہیں عشرتِ دشمن بن کر　　میرے ہوں گے، تو مرا حالِ پریشاں ہوں گے

○

ہر بار نئے شوق سے ہے عرضِ تمنا　　سو بار بھی ہم کہہ کے مکر نہیں کہتے

○

ہائے مجبوریِ عشق نہ رہائے تابِ رشکِ غیر　　وہ سمجھتے ہیں شریکِ عشرتِ محفل مجھے

بسمل صاحب کا شمار اساتذہ میں کیا جاتا ہے اور وہ اس اعزاز کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ زبان و بیان کے لحاظ سے کمالِ استادی اُن کے کلام سے ظاہر ہے۔ وہ قافیوں کو ایسے پہلو سے بٹھاتے ہیں کہ معنی و مفہوم کی چمک کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ ردیفیں اُن کے یہاں اس طرح چسپاں ہوتی ہیں کہ اُن کو مکمل شعر سے الگ محسوس کرنا دشوار ہے۔ بندشوں کی چستی سے اشعار میں روانی اور جھنکار کی لہریں دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ مناسب لفظوں کا انتخاب اور اُن کی مناسب ترتیب، اُن کے انداز کا عام جوہر ہے۔ مثالیں ان کے کلام میں بکھری ہوئی ہیں، میں یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ان کی ایک نظم نما غزل ہے، آزادیِ ہندستان سے متعلق، قافیہ و ردیف ہیں: جہاں آزاد ہے اور کہاں آزاد ہے، اُس کا ایک شعر یہ ہے :

مدتوں کم بخت اسیرِ باغِ ہندستاں رہی
اب جہاں جاہے چلی جائے خزاں آزاد ہے

○

یہاں قافیے (خزاں) کو جس پہلو سے بٹھایا گیا ہے، وہ اہلِ نظر سے دادطلب ہے۔ اسیر و آزاد میں جو تضاد کی نسبت ہے، وہ مزید برآں ——— ان کی ایک غزل کی

ردیف ہے : کہ ہائے ہائے ۔ اس کے ان دو شعروں کو دیکھیے :

کیا پوچھتے ہو میرے سفینے کی واردات
دو ہاتھ رہ گیا تھا کنارا کہ ہائے ہائے
بسمل نہ مل سکا تھا کئی روز سے ہمیں
کل یوں ملا وہ عشق کا مارا کہ ہائے ہائے

دونوں شعروں میں جو کچھ نہیں کہا گیا ہے، ردیف اُس کی ترجمانی خود بہ خود کر رہی ہے، اور یہ کمالِ استادی ہے۔

بسمل صاحب کے دم سے دہلی کے ایک خاصے بڑے حلقے میں شعر و شاعری کے چرچے رہا کیے ہیں۔ انھوں نے بیسیوں نو واردانِ بساطِ شعر کی تربیت کی ہے، اُن کو زبان کے نکات سمجھائے ہیں، بیان کی باریکیوں کا درس دیا ہے، نفظوں کی محت اور اُن کی ظاہری معنوی نسبتوں کو سمجھایا ہے اور اس طرح زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ آج جب کہ زبان کی تعلیم کا سیانہ بت گر چکا ہے اور کم فرصتی نے ذہنوں کو مطالعے سے گویا محروم سا کر دیا ہے! ایسے اساتذہ کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ کم سواد ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ان چیزوں کی نہ ضرورت ہے نہ اہمیت۔ آسان طلبی نے اِس انداز کو فروغ دیا ہے اور اس طرح کی مہمل گوئی کی بہ ہر طور نفی کی جانی چاہیے۔ زبان کا مزاج شناس ہونا بڑی چیز ہے اور یہ سعادت حاصل ہوتی ہے اچھے اساتذہ کے کلام کے مطالعے سے اور اچھے اساتذہ کے پاس بیٹھنے سے۔ میری دعا ہے کہ بسمل صاحب بہ صحت و عافیت رہیں، اسی طرح اچھے اچھے شعر کہتے رہیں اور نو واردانِ شعر و ادب کی تربیت کرتے رہیں۔

(ڈاکٹر) عنوان چشتی

بسمل سعیدی کا تغزّل

بسمل سعیدی اُردو کے اُن شاعروں میں ہیں جو گذشتہ پچاس پچپن برس سے اُردو شاعری کے شیش محل میں اپنے فکر و فن سے اجالا کر رہے ہیں۔ انھوں نے یوں تو ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کے جوہرِ طبع کے پھول بطورِ خاص غزل کے میدان میں کھلتے ہیں۔ اور اس کافر صنفِ سخن کو انھوں نے اتنا رام کر لیا ہے کہ اب ان کا نام کلاسیکی انداز کی غزل کہنے والے ممتاز شاعروں میں آتا ہے۔ غزل کی مینا کاری کے لیے جس فنّی ریاضت، ادبی شعور اور لگن کی ضرورت ہے اس کا ثبوت انھوں نے قدم قدم پہ دیا ہے۔ اور اپنی عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ غزل کی خابندی میں صرف کر دیا ہے۔ اگر مجھ سے کہا جائے کہ میں مختصر ترین الفاظ میں بسمل سعیدی کی شاعری کی بنیادی خصوصیت کی طرف اشارہ کروں تو میں صرف "تغزل" کہوں گا۔

تغزل کی اصطلاح کثیر الاستعمال ہے اور کثیر المعانی بھی، اس کا چلن قدیم تنقید سے جدید ترین تنقید تک ملتا ہے۔ مگر ہر جگہ اس کا مفہوم یکساں نہیں، ہمارے تذکرہ نگاروں ادبی مورخوں اور نقادوں نے اس لفظ کو اتنی فراوانی سے برتا ہے کہ اب اس کا کوئی مفہوم متعین کرنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو گیا ہے۔ میر اور اقبال کا مزاجِ شعری مختلف ہی نہیں متضاد بھی ہے مگر دونوں کے یہاں تغزل ہے اور دونوں کے "تغزل" کا مزاج جداگانہ، اسی طرح خواجہ میر درد کا تغزل حسرت موہانی کے تغزل سے مختلف ہے۔ ہر غزل گو کے یہاں تغزل موجود ہے مگر ہر جگہ اس کا رنگ و آہنگ جداگانہ ہے۔

'تغزل' کے دو پہلو ہیں ایک اس کے موضوع و مواد سے وابستہ ہے اور دوسرا طرزِ فکر و احساس و اندازِ پیشکش سے متعلق جذبات و کیفیات کا بیان یقیناً تغزل کا ایک عنصر ہے بعض نقادوں کے نزدیک تغزل محض "حسن و عشق" تک محدود ہے۔ حسن و عشق کے بھی

دو پہلو ہیں۔ ایک محبوب کے سراپا اور عاشق کی ہیئت کذائی کا ذکر، دوسرے حُسن کے تاثرات، عاشق کی کیفیات اور بذاتِ خود حُسن کی نفسیات اسی میں وصل اور ہجر کی کیفیات بھی شامل ہیں۔ حسن و عشق کا خارجی اور براہِ راست بیان تغزل نہیں، تعشق ہے لیکن حُسن و عشق کے جذبات و کیفیات کا بیان یقیناً تغزل کا ایک عنصر ہے۔ غزل اگرچہ اپنی نمودِ اوّل سے اب تک محبوبِ مجازی سے بے رخی نہ کر سکی مگر یہ محض اسی کی ہو کر نہیں رہی۔ دوسرے موضوعات سے بھی آنکھ مچولی کھیلتی اور ان کو اپنے پہلو میں جگہ دیتی رہی ہے۔ اپنی ابتدا سے ہی غزل تصوّف، مذہبی عقائد، اخلاقی رموز، فلسفیانہ افکار، سیاسی خیالات، اور تہذیبی قدروں کو جذب کرتی رہی ہے۔ میرے خیال میں تغزل کو کسی ایک دو موضوع تک محدود کرنا تغزل کی روح کے منافی ہے۔ موضوع و مواد کی حد تک اس کا دامن اتنا ہی وسیع ہے جتنا خود زندگی اور غزل کا۔ دراصل تغزل موضوع و مواد سے اتنا متعلق نہیں۔ اسلوب اور طرزِ فکر و احساس سے متعلق ہے۔ اور اس کا براہِ راست رشتہ شاعری کے جمالیاتی تقاضوں سے ملتا ہے۔ شاعری کے جمالیاتی تقاضوں کی دو پرتیں ہیں پہلی خارجی جس میں الفاظ کا انتخاب و ترتیب، حروف، الفاظ، تراکیب، قوافی اور بحر کا آہنگ شامل ہے۔ اور داخلی جس میں تخلیقی تجربے کی بنیادی خصوصیت شامل ہے۔ شاعر کے مشاہدے یا حسی تجربے سے جمالیاتی کیفیت تک ایک پیچ در پیچ طویل سفر ہے۔ ابتدائی طور پر فنکار کا ہر تجربہ مادی تجربہ ہوتا ہے۔۔ اور وہ حواسِ خمسہ کے ذریعہ جو 'ادراک' حاصل کرتا ہے وہ فن کا خام مواد ہوتا ہے، یہ خام مواد جو ذہن میں چند نقوش، علامات اور پیکروں کی صورت میں ہوتا ہے، لاشعوری قوتوں سے شہ پا کر وجدان میں ایک ہلکی سی تھرتھری پیدا کرتا ہے، یہ احساس کی اوّلین منزل ہوتی ہے، جب احساس شخصیت کے نہاں خانوں سے مزید تقویت حاصل کر لیتا ہے اور اس کا خارجی اظہار ہونے لگتا ہے تو جذبہ کی منزل شروع ہو جاتی ہے۔ جذبہ کی تشکیل کا عمل ایک پُراسرار داخلی ذہنی اور غیر مجرد عمل ہے، یہی بنیادی عمل جمالیاتی عمل ہے، مگر محض یہ جذباتی عمل بھی کافی نہیں، اس جذباتی عمل میں ذہن کی ایک اور صلاحیت شامل ہو جاتی ہے اور اس کو نئی سمت و جہت، نیز نئی توانائی اور معنویت عطا کرتی ہے، وہ ہے تخیل۔ تخیل ہی دراصل تخلیقی قوت ہے، جو جذباتی تجربے کو نئی روح عطا کر کے اس کو واضح، جاندار اور مجسم کرتی ہے۔ اس لیے دنیا کی ہر زبان اور

ہر عہد کی شاعری کے لیے جذباتی اور تخئیلی عنصروں کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ داخلی یا غنائی شاعری میں تو اس کی اساسی اہمیت ہے۔ غزل میں تغزل، اسی عنصر سے پیدا ہوتا ہے جس کو میں نے جذباتی یا جمالیاتی عنصر کہا ہے لیکن "تغزل" اپنی معراج کو وہیں چھوتا ہے جہاں اس میں تخئیل کی بھرپور رنگ آمیزی بھی ہوتی ہے۔ غزل کا وہ شعر جو محض دماغ کی پیداوار ہے اور جس میں دل شامل نہیں۔ یا بہ الفاظِ دیگر جو خارجی سطحی اور محض شعوری عمل کے نتیجے میں وارد ہوتا ہے تغزل کی بھرپور کیفیت سے خالی ہوگا، غزل کا وہ شعر جو "دروں بینی" داخلیت، جذباتی اور تخئیلی عمل سے گزر کر تشبیہی جمالیاتی کیفیت کا امین ہوگا "تغزل" کا حامل ہوگا۔ اب رہا شعر کی خارجی ہیئت یعنی زبان اور ترتیب زبان کا مسئلہ تو اس میں دو رائیں نہیں کہ شعر کی زبان، تخلیقی تجربے کی بنیادی خصوصیت کا خارجی روپ ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی شاعری کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ ایک وہ شاعری جو محض "مشق و مزاولت" قادر الکلامی ریاض اور فنی دسترس کے بل بوتے پر کی جاتی ہے۔ چونکہ اس عمل کا تعلق تخلیقی تجربے سے نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک خارجی عمل ہوتا ہے اس لیے ایسی شاعری کی زبان اور "اسلوب" تغزل کی بنیادی شرط کو پورا نہیں کرتی۔ ہاں شاعری کی وہ زبان جو تخلیقی تجربے کی بنیادی خصوصیت سے نہ صرف یہ کہ وابستہ ہوتی ہے بلکہ اس کا خارجی ظہور ہوتی ہے، اس میں تغزل کی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ شاعر جو شاعری کی تقدیس کے امین اور محرم ہیں جانتے اور محسوس کرتے ہیں کہ جب کسی خارجی تحریک سے وجدانی لہر بیدار ہوتی ہے جس کو عرفِ عام میں "فکرِ سخن" کا عالم کہا جاتا ہے تو ذہن میں تخلیقی عمل کے دوران ایک خاص گونج پیدا ہوتی ہے، یہ گونج الفاظ اور تراکیب کی گونج ہوتی ہے۔ دوسری منزل میں سنسنی اور تھرتھری پیدا ہوتی ہے یہ الفاظ کی گونج کی کسی قدر ترقی یافتہ منزل ہوتی ہے۔ پھر اچانک کوئی لفظ، ترکیب مصرع یا شعر سطحِ ذہن پر نمودار ہوتا ہے جس کو آمد یا نزولِ شعر کی منزل کہتے ہیں یہ عمل اس عمل سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو الفاظ کو سامنے رکھ کر یا محض ریاضِ سخن کی بنیاد پر ذہنی جمناسٹک کا مظاہرہ ہوا کرتا ہے۔ اس بحث کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ تغزل کا مسئلہ موضوع اور مواد سے اتنا وابستہ نہیں جتنا طرزِ فکر و احساس اور اندازِ پیشکش سے ہے۔

تغزل کی روشنی میں بسمل سعیدی کی شاعری کو واضح طور پر دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک وہ حصّہ ہے جو ان کی قادر الکلامی کا مرہونِ منت ہے۔

اور اس میں تغزل کی جلوہ گری بہت کم ہے اس حصے میں ان کی کئی نظمیں یا نظموں کے ٹکڑے یا غزلوں کے بعض اشعار شامل ہیں۔ لیکن کسی فنکار کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے فن کے روایتی یا کمزور حصے سے نہیں لگایا جاتا بلکہ اس کے فن کے مخصوص، منفرد اور ممتاز حصے سے کیا جاتا ہے۔ بسمل سعیدی محبت کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں لفظ محبت کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ یہ لفظ اپنی پوری جمالیات کے ساتھ دو سطحوں پر نمودار ہوتا ہے۔ ایک سطح تو خالص جذباتی و جمالیاتی ہے۔ جہاں یہ لفظ حسن و عشق کی داخلی کیفیات اور متعلقہ تاثرات کا عکاس ہے۔ اور دوسری سطح پر یہ ایک نئی فکری معنویت کا امین بھی ہو گیا ہے۔ بعض اشعار میں یہ لفظ جذباتی و جمالیاتی کیفیت اور فکری معنویت کا آمیزہ نظر آتا ہے وہاں اس میں تغزل کی بھرپور کیفیات محسوس ہوتی ہیں۔ بسمل سعیدی نے اس لفظ سے ایک جہانِ معنی اور محشرِ جذبات کے اظہار کا کام لیا ہے۔ اس لفظ سے جو جذباتی رشتے اور جمالیاتی تلازمے وابستہ ہیں وہ اس لفظ کو ان کی شاعری میں ایک بھرپور علامت بنا رہے ہیں۔ یہ لفظ اپنے جذباتی و فکری اثاثے کے ساتھ تخلیقی تجربے کی بنیادی کیفیت کا امین اور عکاس بھی ہے اس لیے ایسے اشعار میں تغزل کی روح سمٹ کر مجسم ہو گئی ہے۔

کسی کے دل کی دھڑکن تک کوئی محسوس کرتا ہے
محبت میں یہ اک عالم بھی ہوتا ہے جدائی کا

○

اپنے احساسِ مسرت کو بھی کھو دیتی ہے
جب محبت سببِ غم نہیں ہونے پاتی

اللہ اللہ رے محبت کا وہ عالم کہ جب
کوئی ٹھہرا ہوا عالم نہیں ہونے پاتی

○

کہتے ہیں محبت فقط اس حال کو بسمل
جس حال کو ہم ان سے بھی اکثر نہیں کہتے

○

بے خودیِ عشق، جیسے غم کی نیند
غم کی نیند میں روح کی بیداریاں

○

ہمیں ان کی طرح منظور خود بینی نہیں ورنہ
محبت حسن سے بڑھ کر حسیں ہے اپنی فطرت میں

○

واقف نہ تھا میں ترکِ تعلق سے ہم نشیں
ہوتی ہے ابتدائے محبت یہاں سے کیا؟

اب یوں گزر رہی ہے محبت بن زندگی — جیسے اندھیری رات میں دریا رواں رہے

کئی جگہ محبت کے قائم مقام کے طور پر "عشق" کا لفظ ابھرتا ہے جو محبت کی ہی اگلی منزل ہے۔

گزر کے عشق کی حد سے بھی اب یہ عالم ہے — کہ جیسے عشق ابھی ان کے حسن سے کم ہے

○

عشق نومید تو نہیں لیکن
عشق امید پر نہیں ہوتا

○

عشق رکھتا ہے جس جگہ دل کو
میں بھی اکثر وہاں نہیں ہوتا
عشق ہوتا ہے دل کا اک عالم
دل کا عالم بیاں نہیں ہوتا

○

مجھ سے عہد وفا وہ کیوں چاہیں
حسن خود عشق کی ضمانت ہے

○

محبت کی منزل ایک طلسمی منزل ہے۔ لیسل سعیدی کے یہاں اس طلسم کی نقش گری ہے اور یہ نقش گری داخلیت کے رنگ میں ہوئی ہے، جو تغزل کی بنیادی شرط ہے۔ لیسل سعیدی نے تغزل کی روح کو اپنی شاعری میں اس طرح جذب کیا ہے کہ وہ اپنے داخلی تجربوں کی نقش گری میں جو پیکر تراشتے ہیں وہ اپنے اندر جمالیاتی تجربے کی پوری تازگی محفوظ رکھتے ہیں۔ ہجر کی رات میں چاندنی کا سیاہ نظر آنا وقت کے ہاتھوں کسی چیز کے تباہ ہو جانے کا احساس، یاد کو دور کی آواز سمجھنا، انگڑائی کو جوانی کی بیداری قرار دینا، خود کو محبوب کی نظر سے "دیکھنا" حال اور ماورائے حال میں امتیاز نہ کر سکنا، جس جنازے پر حسرت برستی ہو اس پر خود کا گمان ہونا، اور جبینِ حیات کی سرنوشتِ ازل کو لوحِ مزار کا "کتبۂ غمِ مرگ" قرار دینا محض پراسرار بیت نہیں بلکہ اس کے پردے میں زندگی کی غم زدگی اور بے چارگی، استحصال اور جبر کی وہ تیز و تند اور تلخ کیفیات پنہاں ہیں جو شاعر کے جسم کے ساتھ اس کی روح کو جہنم کی آگ میں گھلاتی رہی ہیں۔

اب ہجر کی رات چاندنی سے	کچھ اور سیاہ ہو گئی ہے
اے وقت نہ پوچھ تیرے ہاتھوں	کیا چیز تباہ ہو گئی ہے

○

حال ہے یا ماورائے حال کچھ کھلتا نہیں	جانے کس عالم میں رکھتی ہے تری محفل مجھے

○

جس جنازے پہ برستی ہوئی حسرت دیکھوں	اس جنازے پہ مجھے اپنا گماں ہوتا ہے

○

یہ مری جبینِ حیات پر، مری سرنوشتِ ازل نہیں
یہ وہ کتبۂ غمِ مرگ ہے، جو لکھا ہو لوحِ مزار پر

بنیادی طور پر سہیل سعیدی کے تغزل کی روح المیہ، حزنیہ یا ماتمی ہے مگر جہاں کہیں انھوں نے خالص جمالیات کی تشکیل کے لیے، محبوب کے سراپا کی نقش گری کی ہے یا "حسن" کا کسی قدر خارجی اظہار کیا ہے وہاں ان کے لہجے میں غنائیت کے ساتھ ایک مدھم سی رجائی چاندنی پھیل گئی ہے اور یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ تغزل محض موضوع و مواد سے متعلق نہیں بلکہ طرزِ پیشکش اور براہِ راست داخلی، جذباتی، جمالیاتی اور تخلیقی تجربے سے متعلق ہے۔ حسن کی شادابی کو پھولوں کے رس میں شرابور قرار دینا، عالمِ شرم و شوق کو مسافر کے پیش و پس سے تشبیہ دینا، محبوب کے سراپا کو رنگ و نکہت کا مجسمہ قرار دینا، غنچہ دہنی اور آواز کی شگفتگی کے تعلق کو قائم کرنا قد کو آفتاب کے قدِ آدم ہونے سے تشبیہ دینا محض رسمی باتیں نہیں بلکہ ان ترکیبوں، استعاروں، تشبیہوں اور پیکروں کی مدد سے شاعر نے اپنے ان داخلی اور ذاتی تجربوں کا انکشاف کیا ہے جو فن کی روح ہیں۔

خوشا عالمِ رنگ و شادابیِ حسن	شرابور ہو جیسے پھولوں کے رس میں
زہے عالمِ شرم و شوق اس نظر کا	کوئی راہ رو جس طرح پیش و پس میں

○

مل گیا رنگ بھی تخلیق میں تیری ورنہ	صرف نکہت تو مجسم نہیں ہونے پاتی

○

غنچہ دہنی تو کوئی دیکھے	آواز میں اک شگفتگی ہے

اک سراپا حسن کا حسنِ سراپا دیکھیے   قلّۂ آدم ہو کے جیسے رہ گیا ہو آفتاب

بسملؔ سعیدی کے تغزّل کا دائرہ عصری حسیت پر بھی محیط ہے۔ انھوں نے گردشِ دوراں سے جو تاثرات قبول کیے انھیں اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ ان کی اس قسم کی شاعری سے ایک ایسا شعری کردار ابھرتا ہے جو نامراد زندگی کو لیے ہوئے اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ حالات کی ستم ظریفی سے وہ جس پھول کو چھوتا ہے وہی خار بن جاتا ہے۔ وہ شعری کردار اپنی ایسی ناکام اور تلخ زندگی کے بارے میں خود کلامی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میری بربادی کی داستان اتنی حیرت ناک ہے کہ اگر کوئی دوسرا مجھے یہ داستان سنائے تو خود مجھے بھی یقین نہ آئے۔ مگر یہ شعری کردار بہت رجائی اور حوصلہ مند ہے۔ اس کو یقین ہے کہ ستم کی عمر تو زیادہ ہے مگر اس کی زندگی زیادہ نہیں۔ وہ دن دور نہیں ہے کہ جب ستم اور ستم گر دونوں باقی نہیں رہیں گے۔

ہوں گے بھی ختم تیرے مقاماتِ مراد ——— ہم کو لیے پھرے گا زمانے کہاں کہاں

بہاریں زندگی کی یوں مری قسمت میں لکھی ہیں   کہ میں جس پھول کو دامن میں رکھوں خار ہو جائے

یقیں نہ آئے کسی اور کی طرف سے مجھے   اگر سنائے کوئی مجھ کو داستاں میری

○

یہ وقت کل نہ رہے گا رہیں گے یاد یہ دن   ستم کی عمر زیادہ ہے زندگی کم ہے

بسملؔ سعیدی نے زبان اور اسلوب کی سطح پر بھی 'تغزل' کی پابندی کی ہے۔ وہ شاعروں کی جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں' وہ شاعری کے فنی اور تکنیکی پہلو کی تکمیل پر گہری نظر رکھتی ہے۔ چنانچہ بسملؔ سعیدی کی شاعری میں حروف، الفاظ و تراکیب اور مصرعوں کے ترنم، بحروں کی موسیقیت کے علاوہ زبان کی صحت اور صفائی کا جوہر بھی موجود ہے۔ ان کا کلام حشو و زوائد سے پاک اور معائبِ سخن سے عاری ہے مگر جہاں کہیں نادر تشبیہوں، استعاروں اور پیکروں کے ذریعہ داخلی اور جمالیاتی تجربے کی نقش گری ملتی ہے یہاں ان کے تغزل میں اور زیادہ تاثر اور دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ انھوں نے "محبت" اور "حسن و عشق" کی کیفیات اور نفسیات نیز زندگی اور زمانے کی نیرنگیوں کو نہ صرف یہ کہ محسوس کیا ہے بلکہ ان تاثرات کو اپنی شعری زندگی کا حصّہ بنایا ہے۔ اور اپنے تخلیقی تجربے کی بنیادی خصوصیت کو غزل کی دلکش اور مہذب نیز دھلی دھلائی زبان میں ادا کیا ہے' مجھے یقین ہے کہ جب تک اردو غزل کی حکمرانی ہے بسملؔ سعیدی کے تغزل کی قدر کی جاتی رہے گی۔

ڈاکٹر نور الحسن انصاری

بسمل سعیدی ــــــ اپنی غزل کے آئینے میں

کسی شاعر کے کلام کو سمجھنے کے لیے اس کے مزاج کی بنیادی خصوصیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ بسمل سعیدی کی افتادِ طبع کا ارتکازی پہلو غیر معمولی محبت اور بلا کی حساسیت ہے، بلکہ یہ بلا کی حساسیت نتیجہ ہے ان کی بلا کی محبت کا اور اس لیے ان کے اشعار کی گہرائیوں تک وہی پہنچ سکتا ہے اور ان کی کیفیات کو صحیح معنوں میں محسوس کر سکتا ہے جس کی طبیعت خود بلا کی حساس ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لطیف و نازک حسیات اور جن ناقابلِ بیان واردات کو انھوں نے وجدان میں ڈوب کر اور کیف میں مسحور ہو کر بیان کر دیا ہے وہ نبض و قلب کی دھڑکن بھی نہیں برداشت کر سکتیں۔ بعض اشعار ملاحظہ فرمائیے:

اب یوں گذر رہی ہے محبت میں زندگی   جیسے اندھیری رات میں دریا رواں رہے

محبت سے کہیں اس کا تحمل ہی نہ ہو بسمل   محبت کے بھروسے پر جو ارماں کر رہا ہوں میں

○

وہ دن میں ہو گیا ہے یہ عالم کہ جس طرح   تیرے ہی اختیار میں ہوں عمر بھر سے ہم

○

ہائے وہ محویتِ ذوقِ تصورِ ہجر میں   جب نفس کی آمد و شد سے بھی گھبراتا ہوں میں
جب وہ ہوتے ہیں تو ہر شے جیسے ہو جاتی ہے گم   وہ نہیں ہوتے تو ہر شے میں انھیں پاتا ہوں میں

○

جہاں سے عشق چاہے زندگی آزار ہو جائے   مسلسل قہقہہ اک آنسوؤں کا تار ہو جائے

○

مشکل تو عشق میری وفا سے بھی تھا مگر   تیری وفا نے اور بھی مشکل بنا دیا

کل اُن کے جلووں پہ تھا میرا اختیارِ نظر
اور آج اپنی نظر کا بھی میں مجاز نہیں

O

کسی کے غم کی یہ مجبوریاں معاذ اللہ
مجالِ خندۂ بے اختیار بھی تو نہیں

O

جدھر منہ پھیرتا جاتا ہوں گھبرا کر تصور سے
وہ حسن ہر جہت میرے مقابل ہوتا جاتا ہے
محبت میں مرے دل کی نزاکت کا یہ عالم ہے
کہ احساسِ محبت بھی تو مشکل ہوتا جاتا ہے

O

محبت کے نہایت نازک احساسات ہوتے ہیں
شگفتِ گُل پہ بھی ہوتا ہے دھوکا جگ ہنسائی کا

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شاعر نے حیات و وجدانیات کی کتنی ماورائی کیفیتیں اظہار و بیان میں لانے کی کوشش کی ہے۔ اِن اشعار سے اُن کی فطرت کا صحیح معنوں میں اظہار ہوتا ہے جس کے لیے نازک، لطیف اور حساس کے الفاظ بہت معمولی ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ بسمل کی فطرت بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ بسمل غزل پڑھتے پڑھتے کبھی کبھی بے اختیار آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے بعض اشعار سُن کر ایک سرد آہ بھر کر رہ جاتے ہیں جیسے یادوں کے خاکستر میں حسرتوں کی چنگاریاں اچانک تڑپ اٹھی ہوں۔ عمدہ اشعار سُنتے ہوں تو ان پر ایک رقت انگیز کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لوگ اس پر متعجب ہوتے ہیں۔ وہ شاید یہ نہ جانتے ہوں کہ اگر سخن گوئی نتیجہ ہے دلِ گداختہ کی تراوش کا، تو سخن فہمی نچوڑ ہے گدازِ قلب اور گدازِ روح کی شرابِ دو آتشہ کا۔ اُردو شاعروں میں سخن گو اور سخن فہم حضرات کی تعداد بہت نہیں لیکن اس دائرہ کو کتنا ہی محدود کیا جائے بسمل اس احاطے سے باہر نہیں رہ سکتے۔

جیسا کہ میں نے کہا بسمل کی شاعری غزل میں اور ان کی غزل بیشتر عشقیہ شاعری میں محدود ہے۔ ہمارے یہاں یوں تو عشقیہ شاعری کا دفتر بے پناہ ہے لیکن اس میں زیادہ تر واردات کے عوض صرف روایات کی کارفرمائی ہے اور اس کا پارچہ مشاقی کے چرخے پر کاتا گیا ہے۔ لیکن بسمل نے اپنے دل کے خون سے اپنا چراغ جلایا ہے اور اپنے دل کی دھڑکنوں کو الفاظ کے سپرد کیا ہے۔ انھوں نے آپ بیتی کے سوا کچھ نہیں کہا۔ اس طرح ان کی شاعری ان کی سوانح عمری ہے جسے شعریت نے رنگین بنایا ہے اور جسے آنسوؤں نے تابانی عطا کی ہے۔" (مقدمۂ کیفِ الم، جوش ملیح آبادی)

بسمل کے عشق پر کسی قسم کا لیبل لگانا درست نہیں ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اصغر کا عشق ماورائی ہے

لیکن حسرت کا عشق خالص زمینی ہے اور ان کی معشوقہ متوسط طبقے کی ایک باعصمت خاتون ہے۔
بسمل کے نزدیک عشق ایک انجانی سی کیفیت ہے جو روح کو ملکوتی رفعت اور فردوسی لطافت بخشتی ہے۔ اس میں عظمت کا بے پناہ آہنگ، خودی کا بے کنار نغمہ اور رفعت کی بے قید و بند لہر ہے۔ اس کی کیفیات غیر فانی اور اس کی حیات ابدیت و ازلیت سے ہم آغوش ہیں۔ اس کی محبوبیاں بڑی پیاری اور اس کی کامیابیاں بڑی ناکام سی ہیں۔ جسمانیت اور مادیت سے متعلق ہوتے ہوئے بھی وہ روحانی ارتفاع کا سرچشمہ ہے اور خودشناسی کا منبع ہے۔ یہاں غم میں ایک نشاط ہے اور الم میں ایک کیفیت۔ نیاز میں ایک ناز ہے اور جنون میں ایک ذمہ داری۔ یہاں آنسوؤں کے قہقہے ہیں اور آہوں کی مسکراہٹ۔ یہاں یاس میں ایک اُمید ہے۔ اور اُمید میں حسرت، الغرض اس عشق کی کیفیتیں متناقض اور متنوع ہیں مگر اس میں آہنگ ہے اس میں کُلَّ یومٍ ھو فی الشان کی ادا بھی مگر اس میں ہم رنگی ہے:

کھوئیں گے دو جہاں کو ہمیں تیرے عشق میں
کھوئے گا تیرا عشق ہمیں دو جہاں سے کیا

○

عشق کی اللہ ری دشواریاں
اک جنوں اور لاکھ ذمہ داریاں
عشق کا غم وہ بھی تیرے عشق کا
کون کر سکتا مری غم خواریاں

○

عشق میں عالمِ وصال تو کیا
ہجر بھی بیشتر نہیں ہوتا
عشق نومید تو نہیں لیکن
عشق امید پر نہیں ہوتا

○

میں بے نیاز سہی تم سے بھی محبت میں
مگر تمہاری محبت سے بے نیاز نہیں

○

لذتِ عشق ہی سے روح کا یہ عالم ہے
اور ابھی حُسن تو احساس کے شامل ہی نہیں

○

بسملؔ اگر نہیں ہے محبت اسی کا نام
تو پھر یہ اضطراب سا کیوں ہے وصال میں

○

عشق ہوتا ہے دل کا اک عالم
دل کا عالم بیاں نہیں ہوتا
عشق رکھتا ہے جس جگہ دل کو
میں بھی اکثر وہاں نہیں ہوتا

میں نے دیکھا ہے ان کی محفل میں کچھ زمان و مکاں نہیں ہوتا

O

حال ہے یا ماورائے حال کچھ کھلتا نہیں جانے کس عالم میں رکھتی ہے تری محفل مجھے

O

کچھ ایسی صورتیں ہیں جو تصور میں نہیں آتیں مگر بس کچھ وہ جیسے دل ہی دل میں یاد آتی ہیں

'حال' و ماورائے حال کی یہی وہ کیفیت ہے جسے عشق سے تعبیر کیا جاسکتا ہے - یہ کیفیت محسوس ہوتے ہوئے بھی غیر محسوس، جانی پہچانی ہوتے ہوئے بھی انجانی اور تعینات کی حد میں ہوتے ہوئے بھی ماورائے تعینات ہے۔ نازو نیاز کی یہ رمز کشائی صوت و آہنگ کی بندشوں میں مشکل سے آتی ہے اور اسی لیے بسمل کے اشعار پڑھنے سے زیادہ محسوس کرنے کے ہیں اگر آپ صرف زبان و بیان کے سہارے اس وجدانی کیفیت کو پانے کی کوشش کریں گے تو ممکن ہے کامیابی نہ ہو۔ کیونکہ یہاں تو لفظ و معنی وجدان و حسیات کی صرف راہ بتا کر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

بسمل کی شاعری میں بلا کا کرب ہے اور ان کی شاعری سے زیادہ ان کی زندگی کربناک ہے نازک آبگینے کو ہلکی سی آہ مدھم کر دیتی ہے بسمل کی بے انتہا حساس طبیعت جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا، غم و آلام کی آگ میں تپ کر درد و کرب کی اس کیفیت کو پہنچ گئی ہے جس کا احساس مشکل ہے۔ وہ روتے نہیں، آہیں نہیں بھرتے لیکن ان کی خاموش بیچارگی ہزار ہا آہ و بکا کا مدفن ہے۔ ان کے غم میں نہ دوپہر کی دھوپ کی شدت ہے، نہ ڈھلتی شام کا اعتدال بلکہ ایک ایسا عالم ہے جیسے ساری کائنات غلافِ سکوت میں ملفوف ہے، نہ سورج کی روشنی ہے نہ تاروں کی جھلملاہٹ نہ دھندلے کی شفق ریزی ہے نہ رات کی ظلمت بیزی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ساری کائنات کسی بیچارگی کی منزل پر آکر رک گئی ہے۔ اس کی نبضیں ڈوب چکی ہوں، اس کی دھڑکنیں بند ہو گئی ہوں اور فضائے کون و مکاں پر ایک عجیب سا سناٹا چھا گیا ہو۔

اب یوں گذر رہی ہے محبت میں زندگی جیسے اندھیری رات میں دریا دواں رہے

O

کسی سے تو کسی کی موت ہی دیکھی نہیں جاتی
مگر مجھ سے تو میری زندگی دیکھی نہیں جاتی

بسمل جلا کے شمعِ تمنّا تمام دن   بیٹھا ہوا ہوں رات اندھیری گذارنے

○

کچھ یہ حالت ہے بسمل اب جیسے   باغ میں باغباں نہیں ہوتا

○

اب چاندنی دھوپ ہو چلی ہے   حد بھی کوئی انتظار کی ہے

ادب میں طربیہ عنصر کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم۔ لیکن اس شخص نے ہنسی کا مطالبہ جس کا دل زخموں سے چور اور دماغ آلام سے ماؤف ہو، خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔ پریم چند کی زندگی کتنی دردناک تھی اس کے باوجود وہ بے ساختہ اور بیجا قہقہے لگاتے تھے۔ یہ غم و آلام سے چشم پوشی نہیں بلکہ خود تسکینی کی کوشش تھی۔ وہی پریم چند جو لوگوں سے اپنا دل قہقہوں کے غلاف میں چھپائے پھرتے تھے، افسانوں میں اس کی کربناکی کو بے نقاب کر دیتے تھے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ادب واقعی زندگی کے عوامل کا عکاس ہے تو پھر ایک خستہ دل، آنسوؤں کے بجائے قہقہے اور آہوں کے بجائے مسکراہٹ کہاں سے لائے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعر نے اپنے احساسات و واردات کو الفاظ و بیان کے دائرہ میں لانے کے لیے کہاں تک صداقت اور خلوص سے کام لیا ہے۔ اس میں فکر و تخئیل کی رنگ آمیزی کہاں تک ہے اور حقیقت نگاری کا رنگ کتنا ہے۔ بسمل نے جو سوچا اسے لکھا جو محسوس کیا اسے بیان کیا، جس جذبے سے تڑپے اس کا اظہار کیا۔ اب اگر ان کے حصّے میں درد و کرب آیا تو اس پر وہ کیف و نشاط کا غلاف کیسے چڑھاتے۔ ان کی المیہ شاعری بے شک ان کی آپ بیتی ہے۔ لیکن[1] غزل گو کے طریقۂ اظہار میں جو تعمیم ہوتی ہے وہ اس کی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیتی ہے۔ اور غزل کے آئینہ میں ہر شخص کو اپنی تصویر نظر آنے لگتی ہے بسمل کی حزنیہ شاعری بھی صرف ان کے دل کی دھڑکن نہیں بلکہ انسانی اکثریت کی خستہ و بدنصیب زندگی کی عکاس ہے۔ ارسطو نے اپنی POETICS میں طربیہ کی بہ نسبت المیہ پر اسی لیے زیادہ زور دیا ہے کہ المیہ شاہکار عمیق جذبات کا ترجمان اور بلند خیالات کا عکاس ہوتا ہے اور اسی وجہ سے دنیا کے عظیم ادبی شہ پاروں کا موضوع بھی زیادہ تر المیہ ہے۔ اب آئیے بسمل کے چند اشعار کو دیکھیں:

بہاریں زندگی کی یوں مری قسمت میں لکھی ہیں
کہ میں جس پھول کو دامن میں رکھوں خار ہو جائے

[1] مسعود حسن رضوی۔ صنفِ غزل پر ایک نظر۔ نگار (انتقادیات نمبر)

موت کا کیا، موت کا تو سو طرح غم کیجیے
زندگی ناشاد کا کس طرح ماتم کیجیے
دیکھ کر اہلِ طرب کا ساز و سامانِ نشاط
بدنصیبوں کا ذرا اندازۂ غم کیجیے

○

خوشی کے نام سے نفرت ہے جب سے ہم یہ سمجھے ہیں
کہ بنتی ہے کسی ناشاد کے غم سے خوشی اپنی

○

کچھ ایسے لوگ محرومِ خوشی دیکھے ہیں دنیا میں
کہ غم کر لی ہے اپنے حق میں اپنی ہر خوشی میں نے

○

اب آنسوؤں نے حقیقت بیان کی اس کی
جو قہقہوں کی زباں پر کبھی فسانہ تھا

○

بہت شاد ہوتی ہے اب جب طبیعت
تو کچھ دیر رونے کو جی چاہتا ہے

○

ہائے وہ دن کہ روز مرتے تھے
آج لالے پڑے ہیں جینے کے

لیکن حیاتِ انسانی کی معراج یہ نہیں کہ ناساعد حالات اُسے اپنے سانچے میں ڈھالتے رہیں۔ حالات و نظریات کی اسی کشمکش میں انسان کا جوہر کھلتا ہے۔ غم کی آگ میں تپ کر اور عشق کی آنچ کھا کر بسمل کی خودی اور جلا پا گئی ہے۔

وہ حالات کے ہاتھوں مجبور اور انقلابات کے شکنجوں میں بے بس سہی مگر ان کی خود دار اور حساس طبیعت یہاں بھی سر جھکانے کو تیار نہیں۔ ان کے کلام میں مجبوری میں ایک شانِ اختیار، بندگی میں ایک غرور اور افتادگی میں ایک سربلندی نظر آتی ہے:

کھا رہا ہوں میں ٹھوکریں لیکن
ٹھوکروں میں ہے سر زمانے کا

○

خود جس قدر بلند ہیں اپنی نگاہ میں
اتنے نہ گر سکیں گے تمھاری نظر سے ہم

○

نشہ میں بندگی کے یوں چور ہو گیا ہوں
کوئی یہ سمجھے جیسے مغرور ہو گیا ہوں

○

مجھے رونا ہے آسانی سے رو لوں گا مقدر کو
مگر مجھ پر تمھیں ہنسنا کہیں دشوار ہو جائے

اور یہیں سے عشق میں وہ غیر فانی کیفیتیں اور بے مثال رفعتیں آتی ہیں جنھیں "محبت کے عظیم لمحوں" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ عشق کی رفعت و عظمت کا تصور اردو شاعری میں جو کچھ ہے وہ تسلیم و رضا تک ختم ہے لیکن دیکھیے بسمل کیا فرماتے ہیں۔

ٹھکرا کے بڑھ گئی نگہِ بے نیازِ عشق جلوے ہزار بار وہ دکھلا کے رہ گئے

○

اب حسن سے بھی مجھ کو عشق بیسزار دیوانے کی کس سے دوستی ہے

○

میں ہوں اور اب آستانِ عشق کی ہیں عظمتیں اب مرے سجدوں کو تیرے نقش پا سے کیا غرض

○

تجلیاں اُسے اپنی نظر جب آنے لگیں نگاہِ عشق میں پھر حُسن بھی سما نہ سکا

عشق اور غم کے یہی وہ لمحات ہیں جو زندگی کو زمان و مکان کی قیود سے بے نیاز کرکے اُسے ابدیت اور آفاقیت سے ہم آغوش کرتے ہیں۔ اگر زندگی ان عظیم لمحات سے محروم ہو تو انسان اور جمادات کے وجود میں کیا چیز مابہ الامتیاز رہ جائے گی۔ مگر یہ عظیم لمحات تو آخر لمحات ہی ہیں ساری زندگی تو نہیں۔ اس کی تشکیل میں سرسری لمحات (Movement of light) کا بھی اتنا ہی اہم ہاتھ ہے۔ آئیے دیکھیں کہ بسمل کے عشق میں سرسری لمحات اپنے دامن میں کیسی کائنات لیے ہوئے ہیں۔

بسمل عشق میں ذہنی کرب اور روحانی اضطراب کے تمام مدارج سے گزرے ہیں۔ اس عشق نے انھیں گداز قلب اور سوزِ دل کی نعمتیں ادا کی ہیں۔ ان کی شاعری کو نکھارا ہے اور ان کی روح کو کندن کی طرح دمکایا ہے۔ یہاں بلند بانگ دعوے نہیں۔ مجنوں کی صحرانوردی اور فرہاد کی کوہ کنی کا جذبہ نہیں وہ تو بس یہ کہتے ہیں۔

وہاں تک محبت نبا ہوں گا تم سے جہاں تک محبت کا امکان ہوگا

اس عشق میں والہانہ سپردگی بھی ہے اور بے نیازی بھی۔ کاہشِ جاں بھی ہے اور بالیدگیٔ روح بھی، کیفِ نشاط بھی ہے اور لذتِ غم بھی، کسک بھی ہے اور مہک بھی، حسن کا اضطراب بھی ہے اور عشق کا اجتناب بھی، عزتِ نفس بھی ہے اور مذاقِ بندگی بھی، کافرانہ ادائیں بھی ہیں اور ملکوتی شان بھی۔ یہ بات مابہ الامتیاز ہے کہ ہر واردات احساس کی تیزی اور تاثیر کی شدت سے شرابور ہے۔ محض لفظ و بیان کی کرشمہ طرازی نہیں۔ یہ دل کی آواز ہے محض دماغ کی سرگوشی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ

اس سے آپ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے :

یہ اُن کی بے نیازی ہے کہ وہ سجدوں کو ٹھکرا دیں
کہیں اپنا مذاقِ بندگی برباد ہوتا ہے

○

تجھے اپنی نظر سے دیکھنے والوں نے دیکھا ہے
کبھی میری نگاہوں سے ترا دیدار ہو جائے
خدا کے واسطے رہنے بھی دو اب ان نگاہوں کو
کہیں مایوس ہونا بھی مجھے دشوار ہو جائے

○

محبت میں خدا جانے ہوئیں رسوائیاں کس سے
میں ان کا نام لیتا ہوں وہ میرا نام لیتے ہیں

○

نہ ہوئی جذبِ محبت کی گوارا توہین
کہ خدا سے بھی دعا کر کے نہ مانگا تم کو

○

گذر گئی تھی ترے ساتھ زندگی کچھ دن
پھر اس کے بعد مزا زندگی کا آ نہ سکا

○

تمام عمر کو جب ہو گئے تھے وہ میرے
تمام عمر کبھی پھر وہ وقت آ نہ سکا

○

نخوت و ناز کا پھر اس کے ٹھکانہ کیا ہے
بے نیازی ہے صفت جس کے طلبگاروں کی

اور یہیں سے بسمل کی شاعری کا ایک اور وصف اُبھرتا ہے جسے نفسیاتی حقائق کے تجزیہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ظاہر ہے کہ غیر معمولی ادراک اور بصیرت کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں نہ صرف نفسِ انسانی کا عمیق مشاہدہ درکار ہے۔ بلکہ ذاتی تجربات کی روشنی اس سے زیادہ کہیں زیادہ ضروری ہے۔ شاعر جو نباضِ کائنات ہوتا ہے ذہن و قلب کی لہروں سے اس کے محرکات اور عوامل تک پہنچ جاتا ہے۔ بسمل صاحب کے یہ چند شعر دیکھیے :

کچھ جذبِ آستاں نے مجبور کر دیا ہے
کچھ ذوقِ بندگی سے مجبور ہو گیا ہوں
میں تجھ سے دور رہ کر تھا تیرے پاس گویا
پاس آگیا تو جیسے کچھ دور ہو گیا ہوں

○

رہ رہ کے اب وہ آپ جھجکتے ہیں اس طرح
جیسے کسی کو دیکھ کے پردہ کرے کوئی

اے دل پھر اُن سے ہوگا نہ تجھ کو کوئی گلا　　اس بزم میں اب آئے تو بیگانہ وار آ

جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ ایک غزل گو عصری تقاضوں کی کہاں تک ترجمانی کرتا ہے، اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میں یہاں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ غزل پر داخلیت کا رنگ غالب ہوتا ہے لیکن دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاعر پہلے خارجی واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ واقعات اس کے دل و دماغ کی مختلف تجربہ گاہوں سے گزرتے ہیں اور تب جا کر ایک خاص تاثر یا واردات کی شکل میں الفاظ و بیان کا روپ اختیار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ غزل کے ہر شعر سے ان محرک واقعات تک پہنچنا مشکل ہے لیکن ایسے اشعار بھی کم نہیں جن کے محرکات کا علم ہم کو ہے۔ میر کا مشہور شعر ہے:

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی　　انھی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

یہ اگرچہ ایک تعمیمی پہلو لیے ہوئے ہے مگر اس کا جو تاریخی پس منظر ہے اس سے کون واقف نہیں کہ غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر انھیں بصارت سے محروم کر دیا تھا۔ اب یہی واقعہ اگر کوئی نظم گو لکھتا تو واقعات کی جزئیات سے بحث کرتا لیکن غزل گو واقعہ کے عمومی تاثر کو پیش کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ بقول مسعود حسن "نظم گو جن واقعات سے متاثر ہوتا ہے ان کو تفصیل سے بیان کر کے ان کے تاثرات کو پڑھنے والوں کے تخئیل کے لیے چھوڑ دیتا ہے اس کے خلاف غزل گو تاثرات کو پیش کر کے واقعات کی تفصیل کو پڑھنے والوں کے تخئیل کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ غزل کا ایک شعر ذہن کو ان تمام واقعات اور حالات کی طرف منتقل کر سکتا ہے۔ جن کے مشاہدے کا نتیجہ یا خلاصہ اس شعر میں پیش کیا گیا ہے۔"[1] جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ غزل گو عصری تقاضوں کو پورا نہیں کرتا وہ شاید تاریخی جبریت کے فلسفہ سے آگاہ نہیں۔ میر اور غالب، ہومر اور ملٹن بھی اپنے اپنے دور کے ترجمان ہیں۔ میر کے دور میں جگر اور جگر کے دور میں میر نہیں ہو سکتے تھے۔ گویا ہر عظیم ادب اپنے دور کی تخلیق ہوتا ہے البتہ اپنے دور کی تخلیق ہوتے ہوئے بھی اس میں کچھ ایسی جمالیاتی شان ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ زمان و مکان کی قیود سے بلند ہوتا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں بسمل کا کلام دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ غزل گو اور خالص عشقیہ شاعر ہونے کے باوجود ان کی شاعری کسی طلسمی گنبد میں نہیں بلکہ آفاق کے گنبد میں گونج رہی ہے۔ پچھلے چالیس پچاس سال میں ہندوستان جن معاشرتی اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی مراحل سے گزرا ہے، اور اس سفر کا مجموعی حاصل اہلِ دل اور اہلِ بصیرت کے حصے میں جس صورت میں آیا اس کو سامنے رکھتے ہوئے ان اشعار

[1] صنفِ غزل پر ایک نظر:۔ نگار (انتقادیات نمبر ۴۶ء)

کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ روحِ عصر ان میں کس طرح تڑپ رہی ہے۔

دیکھ کر اہلِ طرب کا سازو سامانِ نشاط
بد نصیبوں کا ذرا اندازۂ غم کیجیے

O

عبرت کا مُرقع ہیں دنیا میں وہ ویرانے
باقی ہیں ابھی جن کی آبادی کے افسانے

O

خوشی کے نام سے نفرت ہے جب سے ہم یہ سمجھے ہیں
کہ بنتی ہے کسی ناشاد کے غم سے خوشی اپنی

O

الٰہی دنیا میں اور کچھ دن ابھی قیامت نہ آنے پائے

ترے بنائے ہوئے بشر کو ابھی میں انساں بنا رہا ہوں

فلسفۂ قربانی پر شاید اس سے عمدہ شعر نہیں کہا جا سکتا

عدم کے تاریک راستے میں کوئی مسافر نہ راہ بھولے
میں شمعِ ہستی بجھا کے اپنی چراغِ تربت جلا رہا ہوں

بسملؔ کی شاعری میں "کھو جانے" کی کیفیت بھی ملتی ہے، وہی کیفیت جسے تصوف میں "حیرتِ حسنہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ بظاہر یہ وصف اس ادراک و بصیرت کے منافی معلوم ہوتا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن حیرت اور بصیرت میں تضاد نہیں، درحقیقت حیرت بصیرت کی وہ حد ہے جب ادراکِ انسانی پر احساسِ بیچارگی کا غیر شعوری سایہ پڑ جاتا ہے گویا احساسِ بیچارگی حیرت کی ابتدائی منزل ہے اور تحیّر و سرگشتگی اس کی معراج یعنی وہ کیفیت جب ذوقِ طلب اپنی منزل بھول کر خود اپنے آپ میں کھو جاتا ہے۔ پہلے احساسِ بیچارگی کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:

وہ عشق ہے جو دل کو گوارا کبھی نہ ہو
اور دل رہے نہ جس کو گوارا کیے بغیر
سر کو اٹھا بھی لوں جو ترے سنگِ در سے میں
دل مانتا نہیں تجھے سجدا کیے بغیر

O

کچھ تو جفا میں ان کی ملتی ہے مجھ کو لذت
اور کچھ وفا سے اپنی مجبور ہو گیا ہوں

بےچارگی کی یہ کیفیت باقی نہیں رہتی اور یہ احساس حیرت کی منزل تک پہنچا کے ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور پھر یہ عالم ہوتا ہے:

تجھے بھی بھول گئے تجھ کو ڈھونڈنے والے

یہ ہوش بھی تو نہیں ہے کہ جستجو کیا ہے

عشق رکھتا ہے جس جگہ دل کو ۔۔۔ میں بھی اکثر وہاں نہیں رہتا

○

حال ہے یا ماورائے حال کچھ کھلتا نہیں ۔۔۔ جانے کس عالم میں رکھتی ہے تری محفل مجھے

○

گذر گیا ہے محبت میں اک وہ عالم بھی ۔۔۔ کہ مدتوں مجھے تو خود بھی یاد آ نہ سکا

میں نے کہا ہے کہ بسمل نے واردات و حسیات کی جن اچھوتی حدوں کو چھونے کی کوشش کی ہے وہاں تک الفاظ و اصوات کی رسائی مشکل سے ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار پڑھنے سے زیادہ محسوس کرنے کے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے اندازِ بیان میں کسی طرح کا نقص اور کسی طرح کی کمی ہے۔

بسمل کے اندازِ بیان کے لیے سلاست و جزالت، برجستگی، سادگی و صفائی، حسنِ ادا، بندش کی چستی اور ترکیب کی دلکشی جیسے الفاظ استعمال کرنے سے اس میں چار چاند نہیں لگ جائیں گے ہر متوسط درجے کے شاعر میں یہ خوبیاں موجود ہوتی ہیں۔ یہ اوصاف اچھے شعر کے لیے لازمی سہی مگر اس کو 'چیزے دگر' کا جوہر نہیں عطا کرتے۔ میر اور غالب کی زبان میں وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے وہ آج بھی 'آج کے شاعر' معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا تجزیہ مشکل ہے لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو دوسروں کے دلوں پر طاری کر دیتے ہیں۔ بسمل کے اندازِ بیان کی خوبیوں کا تجزیہ بھی کما حقہ مشکل ہے۔ البتہ اُن کے اسلوب کے تار و پود میں شعوری اور غیر شعوری طور پر انشائیہ اندازِ کلام کا بہت ہاتھ ہے۔ اربابِ بلاغت کا اتفاق ہے کہ جتنا اثر انشائیہ کلام میں ہوتا ہے رجزیہ میں نہیں ہوتا۔ بسمل کی شاعری میں 'کھو جانے' کی جو کیفیت ہے وہ بھی اسی انشائیہ اندازِ بیان کا ایک پہلو ہے:

قیودِ عشق سے شاید گذر گیا ہو کوئی ۔۔۔ حدودِ حسن سے لیکن نکل کے جا نہ سکا

○

گر نہیں تو جان سے بڑھ کر عزیز ۔۔۔ جان کیوں تیرے لیے کھوتے ہیں ہم

○

وفا کر کے میں بھی پشیماں ہوا ہوں ۔۔۔ جفا کر کے تو بھی پشیمان ہوگا

○

کون ہے جو نہیں زمانے میں ۔۔۔ کس سے شکوہ کریں زمانے کا

اس قسم کے اشعار سے ان کا کلام بھرا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ نہ، تو، شاید، ارے، ذرا، سا، بھی، ہی جیسے الفاظ جو بظاہر اہم نہیں معلوم ہوتے اور جن کے ذریعہ معمولی شعرا محض وزن کی خانہ پُری کرتے ہیں، بسملؔ کے اشعار میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف تو ان سے اندازِ بیان میں بے تکلفی اور روزمرّہ کی شان اُبھر آتی ہے اور دوسری طرف بہت ہی لطیف اور نازک کیفیات کی بڑی عمدہ ترجمانی ہو جاتی ہے:

جیسے کسی نے مجھ سے مجھے چھین سا لیا — اس طرح سے تو مجھ کو نہ دیکھا کرے کوئی

O

کسی کے غم کی یہ مجبوریاں معاذ اللہ — مجالِ خندۂ بے اختیار بھی تو نہیں

O

اب کچھ اس طرح میں اس بزم میں ہوتا ہوں شریک — کوئی سمجھے کہ یہ وابستۂ محفل ہی نہیں

O

تعلقاتِ محبت کی جان ہوتی ہے — وہ اک نگاہ بظاہر جو دلنواز نہیں

ان سادہ اور ہلکے پھلکے الفاظ سے جہاں زبان میں اجمال و ایمائیت کا جوہر ابھرتا ہے وہیں اس میں لطافت و نفاست کی لہریں بھی کروٹیں لینے لگتی ہیں اور احساس و واردات کی ایک کائنات اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ بسملؔ کی شاعری میں لہجہ کا بڑا دخل ہے۔ انشائیہ اندازِ بیان نے لہجہ کی اہمیت اور زیادہ کر دی ہے۔ شعر اور لہجہ میں وہی تعلق ہے جو نغمہ اور سُر میں ہے۔ بہت سی ناقابلِ بیان کیفیات محض لہجے سے بتائی اور سمجھائی جا سکتی ہیں۔ "کیا بات ہے" معمولی سا جملہ ہے۔ لیکن لہجہ بدلتے جائیے جملہ کی نوعیت اور معنویت بدلتی جائے گی۔ طنز و تعریض، استعجاب و تحیّر، استفہام و حسرت کی ساری لطافتیں لہجے اور صرف لہجے میں پوشیدہ ہیں۔ بسملؔ نے لہجہ سے کلام میں کیا شان پیدا کر دی ہے، دیکھیے:

وہ کیوں ہونے لگے، لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے — کہ جیسے وہ بھی شامل ہوں مرے حالِ پریشاں پر

قفس میں جو ہوا کے سرد جھونکے آتے رہتے ہیں — الٰہی کیا بہاریں اب بھی آتی ہیں گلستاں پر

کہتے ہیں اگر غزل میں ایک شعر بھی غیر معمولی نکل آئے تو ساری غزل کا کفارہ ادا ہو جاتا ہے لیکن بسملؔ صاحب کی اکثر غزلیں ایسی ہیں جہاں انتخاب مشکل ہو جاتا ہے اور غزل کا ہر شعر ایک سراپا ناز کی طرح دامنِ دل اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ ایک ایسا وصف ہے جو بہت کم غزل گو شاعروں کے حصے میں آتا ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی

طنز اور بسمل سعیدی

اُردو کی مختلف اصنافِ سخن پر مغربی اثرات خواہ کتنے ہی سود مند ثابت ہوئے ہوں، طنز کے لیے کُل ملا کر یہ سودا گھاٹے کا رہا۔ قدما سے لے کر متوسطین تک (جن کے عہد میں اُردو ادب پر مغرب کی اثر اندازی کا آغاز ہوا) جس قابلِ ذکر شاعر کا کلام دیکھیے، ہر غزل میں اس قسم کے اشعار وافر تعداد میں نظر آئیں گے:

جسے عشق کا تیر کاری لگے ۔۔۔ اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
(ولی)

اے شبِ ہجر راست کہہ تجھ کو ۔۔۔ بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے
(میر)

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں ۔۔۔ کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں
(سودا)

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو ۔۔۔ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
(میر درد)

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو ۔۔۔ یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے
(قائم)

یہ عجیب رسم دیکھی کہ بروزِ عید قرباں ۔۔۔ وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا
(مصحفی)

سامنے میرے جو منہ کرکے نہیں تم بیٹھتے ۔۔۔ کیا کسی کے سامنے ہے یہ قسم کھائی ہوئی
(جرأت)

آفریں تم پہ، یہی چاہیے شاباش تمہیں
دیکھ روتا مجھے یوں ہنسنے لگو، اور سنو
(انشاؔ)

اپنے آرام سے ہوں دشتِ جنوں میں تنہا
کسی محبوبِ دل آرام سے کچھ کام نہیں
(ناسخؔ)

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا
(آتشؔ)

کیا ہوئی تقصیر ہم سے، تو بتا دے اے نظیرؔ
تاکہ شادی مرگ سمجھیں ایسے مرجانے کو ہم
(نظیرؔ)

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں
(غالبؔ)

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
(مومنؔ)

رات اک بگڑی ہوئی تھی میکدے میں رند سے
ذوقؔ وہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو
(ذوقؔ)

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
(انیسؔ)

پوچھیے میکشوں سے لطفِ شراب
یہ مزہ پاک باز کیا جانیں
(داغؔ)

بڑے صاف طینت، بڑے پاک باطن
ریاضؔ آپ کو کچھ نہیں جانتے ہیں
(ریاضؔ)

ان کو حالیؔ بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت
(حالیؔ)

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ ان اشعار کی رگوں میں طنز کا کیسا خالص اور کتنا گرم لہو جوش مارتا ہے۔ یہ صورتِ حال صرف غزل تک ہی محدود نہ تھی۔ مثنوی، قطعات، واسوخت،

شہر آشوب اور دوسری شعری اصناف میں طنز کی کارفرمائی کا غلبہ نظر آتا ہے۔ میر کا قطعہ "دکل پانچو ایک کاسۂ سر پر جو آگیا" ——— اور مثنوی در مذمت خانۂ خود، سودا کی تضحیکِ روزگار، نظیر کا "بنجارہ نامہ" اور "آدمی نامہ"، امانت کے واسوخت وغیرہ میرے اس بیان کی شہادت کو موجود ہیں۔ غالب قصیدے جیسی صنفِ سخن میں "آپ کا بندہ اور پھرے ننگا" قسم کا لہجہ اختیار کرتے ہیں اور انیس مرثیوں میں بھی خالص طنز کی گنجائش رکھتے ہیں۔ یہاں میں ایک اور دلچسپ پہلو پر آپ کی توجہ چاہوں گا۔ اردو کا جو شاعر جتنا زیادہ اہم اور جتنا زیادہ بلند قامت ہے اس کے ہاں طنز کی کارفرمائی اسی مناسبت سے اتنی ہی زیادہ نظر آتی ہے چنانچہ میر، سودا، آتش، غالب اور انیس محولہ بالا شعراء میں اپنا مرتبہ بلند رکھتے ہیں تو ان کی شاعری میں طنز بھی جزوِ اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب کی عظمت کے بارے میں آج دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ اُن کے اشعار کا ایک بنیادی وصف اُن کی خالص اور پہلودار طنز ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ اُردو شاعری میں خالص طنز کی توانا روایت موجود تھی اور اس کی جڑیں بہت گہرائی تک پہنچی ہوئی تھیں۔ پھر وہ دور آیا جب پیرویِ مغرب کا مصلحت آمیز رجحان عام ہوا اور اُردو ادب میں تنقید نے تو خالصتاً مغربی اثرات کے تحت ہی جنم لیا اور پرورش پائی چنانچہ ہم نے دیکھا کہ نو غلامانہ ذہنیت اور مرعوبیت نے مصلحت وسیاستِ وقت کے ماتحت اُردو ادب کی انھیں اصنافِ سخن کو مرتبۂ قبولیت بخشا جن کے نمونے مغرب کی بیانیہ شاعری میں موجود تھے چونکہ غزل جیسی کوئی صنف انگریزی ادب میں نہ تھی اس لیے اُردو غزل کو تنقید نے اپنی ولادت کے فوراً بعد سے ہدفِ ملامت بنایا۔ ہمارا طنزیہ ادب بھی اس صورتِ حال سے دوچار ہوا کیونکہ انگریزی ادب میں خالص طنز کی روایت بید ضعیف تھی اور مزاح کا دور دورہ تھا۔ وہاں مزاح کی ایک شاخ SATIRE بہت مقبول تھی جس میں مزاح نگار حصولِ مقصد کے لیے ظرافت کے ساتھ ہجوِ ملیح یا ہلکے سے طنز کی آمیزش بھی کرلیتا ہے۔ ہماری نابالغ تنقید نے مغرب سے مرعوب ذہن کے ساتھ اسی SATIRE کی تعریف کی کسوٹی پر اُردو کے طنزیہ ادب کو بھی آنکنا شروع کردیا اور رفتہ رفتہ یہ خیال جڑ پکڑتا گیا کہ طنز ومزاح ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ وہی طنز کامیاب سمجھی گئی جس میں مزاح کا عنصر غالب ہو۔ خالص مزاح کو مستحسن لیکن خالص طنز کو لائقِ تعزیر قرار دیا گیا۔ اہلِ لغت نے بھی طنز کے معنی بیان کرنے میں نہایت سامحت اور استغنا سے کام لیا اور یہ

محدود ہو کر خاموش ہو گئے کہ ناز کرنے، مسخرہ پن کی گفتگو کرنے اور رمز کے ساتھ بات کرنے یا طعنہ دینے کو طنز کہتے ہیں۔ طنز کی اس مسخ شدہ تعریف اور مزاح کے ساتھ اس کے تقریباً ناجائز تعلق کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزاح کی طرح طنز کو بھی ادب میں دوسرے درجہ کی چیز سمجھا جانے لگا حالانکہ بقول عبدالباری آسی طنز کثیر المعنی لفظ ہے جس میں طعن، آوازہ، تشنیع، استہزاء، پھبتی، زجر و توبیخ، ملامت، ہجو ملیح، بولی ٹھولی، شکوہ شکایت، نوک جھونک، رمز و کنایہ، جلی کٹی، و اسوخت وغیرہ سبھی شامل ہیں۔ ان اجزاء کو اردو ادب سے خارج کر دیجیے تو نہ لہجہ کی انفرادیت برقرار رہ سکتی ہے نہ کیلے کے پتے کی طرح بات سے بات نکل سکتی ہے۔ لے دے کر سپاٹ، یک رخی، اور سطحی بیانیہ شاعری ہمارے دامن میں رہ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ بالغ نظر فنکار طنز سے برابر کام لیتے رہے اور ہمارے مغرب پرست نقاد اس پہلو سے ہمیشہ پہلو تہی برتتے رہے۔

لطیفہ یہ ہے کہ حضرت حالیؔ پیروی مغرب کے اوّلین داعیان میں سے ہیں اور مسدس "مدوجزر اسلام" ان کا شاہکار ہے۔ غور کیجیے تو یہ پوری مسدس خالص طنز کی بنیاد پر کھڑی ہے لیکن ہم اسے درجۂ اوّل کی چیز مانتے ہیں۔ SATIRE کے معیار پر لانے کے لیے اگر حضرت حالیؔ نے اس مسدس میں ظریفانہ لہجہ اختیار کیا ہوتا تو ظاہر ہے کہ مسدس کی حیثیت اکبر الٰہ آبادی کی شاعری سے بھی کمتر رہ جاتی۔ آگے چلیے تو اقبالؔ کی شاعری کا قصر بلند بھی خالص طنز کی اساس پر ایستادہ نظر آتا ہے۔ شکوہ، جواب شکوہ، طلوعِ اسلام، مسجد قرطبہ، اور اقبال کی دوسری اہم نظموں میں طنز ہی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ کچھ اور آگے آئیے تو جوشؔ کی گھن گرج والی شاعری میں صرف وہی چیزیں زندہ نظر آتی ہیں جن میں طنز کی کارفرمائی ہے۔ یگانہؔ اور شاد عارفی کا تو خاص حربہ ہی طنز ہے۔ موجودہ نئی شاعری کی ایک بنیادی خصوصیت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اس کا لہجہ طنزیہ ہے۔ اردو نثر کا حال بھی تقریباً یہی ہے۔ ابوالکلام آزادؔ کی نثر سے طنز خارج کر دیجیے تو اس کی ساری بلاغت دھواں ہو کر رہ جاتی ہے۔ منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت اور قرۃ العین حیدر سے لے کر موجودہ افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں تک ہر ایک کی تخلیق میں طنز کا مصالحہ کام میں لایا گیا ہے۔ یہ مصالحہ علیحدہ کر لیجیے اور دیکھیے کہ کس طرح ان کے فن کا جوڑ جوڑ الگ ہو جاتا ہے۔

طنز تلوار کی دھار پر چلنے جیسا خطرناک فن ہے۔ اس میں قدم قدم پر ایسے نازک

مقامات آتے ہیں کہ ذرا توازن بگڑا اور طنز نگار ابتذال اور پھکڑپن کے تحت الثریٰ میں جا گرا۔ بطورِ خاص غزل جیسی نازک مزاج صنفِ سخن میں بامقصد اور سنجیدہ طنز نگاری کے تقاضوں سے بلند مرتبہ اور باصلاحیت فنکار ہی عہدہ برآ ہوسکتے ہیں چنانچہ میں نے اصول بنا رکھا ہے کہ کسی شاعر کے متعلق رائے قائم کرتے ہوئے دیکھتا ہوں کہ وہ طنز سے کس حد تک اور کیسا کام لے سکا ہے۔

بسملؔ سعیدی ایک چھوٹی سی دیسی ریاست، ٹونک، میں پیدا ہوئے وہیں پروان چڑھے اور اسی ریاست میں انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بھی کیا۔ دیسی ریاستوں میں مطلق العنان شخصی حکمرانوں کی خوشنودی ہی فنکار کی معراجِ کمال ہوا کرتی تھی۔ غیور، خوددار اور بیباک شاعروں کا ایسی کسی ریاست میں زندہ رہنا دشوار تھا اور طنز نگار کے لیے یہی اوّلیں شرائط ہیں۔ بسملؔ صاحب کے مجموعۂ کلام " اوراقِ زندگی " میں اس طرح کے اشعار کی معتد بہ تعداد دیکھ کر میں ایک عجیب قسم کی استعجاب آمیز مسرت سے دوچار ہوا:

کس قدر ان کی طبیعت پہ گراں ہوتا ہے
جس فسانے میں وفاؤں کا بیاں ہوتا ہے

o

کس قدر خوش فہم تھے، جو لوگ اگلے وقت میں
مسجدیں بنوا دیا کرتے تھے بت خانوں کے ساتھ

o

رسم و رواجِ دہر میں کیا یہ بڑی کمی نہیں
ماتمِ مرگ ہے مگر ماتمِ زندگی نہیں

o

عینِ دریا کا تلاطم تو رہا ساحل تک
ہوگیا قہر وہ طوفان جو ساحل سے اٹھا

o

معاذ اللہ شیخ و برہمن کا ظاہر و باطن
گناہوں نے پہن رکھا ہے جامہ پارسائی کا

o

ہم اپنی اُمیدوں پہ زندہ ہیں اب تک
تمھارے تو قول و قسم پر نہیں ہیں

o

مری زندگی تن کا بوجھ کچھ نہیں بسملؔ ارضِ وطن پہ کم
مری موت کا تو خدا کرے نہ ہو بار خاکِ دیار پہ

پڑتے ہی جبینِ وقت پہ بل،
کج اپنی کلاہ ہو گئی ہے

مسجد میں قیامت آ رہی ہے بت خانے میں بن رہی ہے دنیا

○

تیری مٹھی سے زیادہ کاسۂ سائل میں ہے کیا ترا دستِ کرم ہے ایک مٹھی کے سوا

○

وہ اور ہوں گے جو امیدوار بیٹھے ہیں وہ بے نیاز تو مستغنیِ کرم ہیں ہم

○

تو پھر اے دشتِ وحشت پاک کر قصہ ہی دامن کا
نہ گل اپنے گلستاں میں نہ خار اپنے بیاباں میں

○

ٹھوکروں میں ہے سر زمانے کا کھا رہا ہوں میں ٹھوکریں لیکن

○

کھو گئے خود وہ رہ گزاروں میں جن کو دعوے تھے رہنمائی کے

یہ اشعار ہمیں آتش کے سپاہیانہ لہجے کی یاد دلاتے ہیں۔ مصاحبت اور درباداری کے ماحول میں تربیت یافتہ شاعر کے ہاں جو ہزیمت پسندی، انفعالیت اور چکنا چپڑا انداز بیان ہونا چاہیے، بسمل صاحب کے کلام کا بیشتر حصہ اس کے برعکس ہے۔ دو ٹوک بات کہنے، بیانِ وفا پر اصرار کرنے، اپنی امیدوں پہ زندہ رہنے، موت کی جگہ زندگی کا سوگ منانے، جبینِ وقت پر بل دیکھ کر اپنی کلاہ کج کر لینے، کاسۂ سائل کو دستِ کرم پر فوقیت دینے، ساحل سے اُٹھنے والے طوفان کو ٹھہر بنا دینے، بے نیازوں کے رُوبرو مستغنیِ کرم ہو جانے، شیخ و برہمن کو مجسّم گناہ قرار دینے، دستِ وحشت کو حسبِ موقع دامن کا قصہ ہی پاک کر دینے کا مشورہ دینے اور ٹھوکریں کھانے کے باوجود زمانے کو ٹھوکروں میں رکھنے والا یہ شاعر جاگیردارانہ نظام کی دلدل سے کتنا بلند ہو گیا ہے جو اس کے گلے تک آئی ہوئی تھی۔ عام اور خود ساختہ شاعران حالات میں صیدِ زبوں ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دامانِ فکر سے حالات کی گرد کو اس طرح جھٹک کر اوپر اُٹھ جانا بسمل صاحب کے اصل اور کھرے شاعر ہونے کی دلیل ہے۔

بسمل سعیدی دلِ دردمند رکھتے ہیں، غم اور لوازماتِ غم کی ترجمانی اُن کے بیشتر اشعار میں انتہائی خوبصورت اور متاثر کن انداز میں کی گئی ہے لیکن وہ کہیں بھی فانی کی طرح محض

رونے بسورنے اور قنوطیت کی چادر اوڑھ کر دنیا سے بے زاری کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ حکایت و روایتِ غم کے بیان میں بھی ان کے دل کا درد نشتروں کا سا تیکھا پن لے کر شعروں میں نمودار ہوتا ہے۔ یہ نام نہاد ترقی پسندوں کی بات نہیں کرتا، نیکی، صداقت اور حُسن کے سچّے پرستاروں کی طرح، جنھیں باطل پر حق کے غلبہ اور بدی پر نیکی کی فتح کا یقین ہے، بسملؔ سعیدی بھی تخریب پسند قوتوں کو نیست و نابود کرنے اور صحت مند رجحانات کو عام کرنے کے لیے اپنی شاعری میں طنز سے بھرپور کام لیتے ہیں۔ ان اشعار کا بانکپن دیکھیے :-

وہاں کیا مانعِ بیدادِ قتل، احساسِ خجلت ہو
جہاں سو دشنۂ خوں ریز ہوں چشمِ پشیماں میں

وائے بیدادِ جنوں، دشت میں دیوانے کو
ہر طرف کچھ در و دیوار نظر آتے ہیں

وہ کریں جو معذرتِ ستم، تو خوشا نصیب، زہے کرم
نہ بھلا سکیں گے مگر وہ ہم جو گزر گئی دلِ زار پر

اگر اب کرم اُن کے ہم پر نہیں ہیں
تو ہم بھی اب ان کے کرم پر نہیں ہیں

ترکِ دُنیا فریب ہے بسملؔ
یہ بھی اک وضعِ استعانت ہے

مرا کارواں منزلِ مرگ میں ہے
کوئی صُور پھونکو صدائے جرس میں

ایک یہ تیری بزمِ عیش، ایک وہ غم کدے جہاں
شمع کی روشنی تو کیا، چاند کی چاندنی نہیں

اپنی سوزش میں بھی ہوتا ہے جہنم محسوس
غیر کی آگ کا شعلہ بھی دھواں ہوتا ہے

زمانے کے بلند و پست کے نرغے میں ہیں لیکن
زمانے کو ہمیں زیر و زبر کرنا بھی آتا ہے

اس طرح جذباتِ آزادی بہل جائیں گے کیا　　بن رہا ہے کیوں قفس میں آشیاں میرے لیے

○

بزمِ بیداد میں اُجالا ہے　　جانے کس کے سیاہ خانے کا

○

راحتِ آشیاں ہے اُس پہ حرام　　جس کو ہے ذوقِ لذتِ پرواز

غزل چونکہ وارداتِ قلب کی ترجمانی کرتی ہے اور طنز خارج سے برانگیختگی کے زیرِ اثر برآمد ہوتی ہے اس لیے اکثر دیکھا گیا ہے کہ طنز نگاری کے نام پر لوگ سامنے سامنے کی باتیں کر کے رہ جاتے ہیں۔ داخلی کیفیات، نفسیاتی پیچ و تاب اور عمیق جذبات کی عکاسی کے مواقع پر ان کا قلم لڑکھڑانے لگتا ہے۔ بعض خامکار شاعروں کے ہاں طنز ایسے بھونڈے پن سے استعمال ہوتی ہے کہ غزل کی متغزلانہ فضا اور وجدان مجروح ہو جاتے ہیں۔ بسملؔ صاحب کے ہاں جذبہ اپنی اصلیت اور شدت کے ساتھ طنز کے قالب میں ڈھلتا ہے۔ ان کے اشعار اپنی غنائیت، طرزِ ادا، ایمائیت، سادگی اور حسن کے ساتھ صاف ستھری لطیف طنز کی آمیزش رکھتے ہیں اور جذبے کی پیچیدگی نہ کہیں زبان میں لکنت پیدا کرتی ہے نہ طنز کی دھار کند ہونے پاتی ہے۔ حقیقی فنکار کے ہاں خارجیت اور داخلیت باہم اس طرح آمیز ہو جاتے ہیں کہ مَن و تُو کا فرق ہی مٹ جاتا ہے۔ بسمل صاحب کے چند شعر اور ملاحظہ ہوں :

اب کچھ اس طرح میں اُس بزم میں ہوتا ہوں شریک
کوئی سمجھے کہ یہ وابستۂ محفل ہی نہیں

○

تیشہ ہے نفس کا صرفِ کاوش　　دل ہے کہ تمام بے ستوں ہے

○

اُڑتا ہے اُس ہوا سے بقدرِ نفس ہے جو　　تصویر میں وہ رنگ بھرا ہے کہ ہائے ہائے

○

وقت کب تک گزاریے آخر　　یوں کہیں زندگی گزرتی ہے
کون محفوظ، کون مستثنیٰ　　کس کو دنیا معاف کرتی ہے

خود جس قدر بلند ہیں اپنی نگاہ میں — اتنے نہ گر سکیں گے تمھاری نظر سے ہم

○

اب یوں گزر رہی ہے محبت میں زندگی — جیسے اندھیری رات میں دریا رواں ہے

○

باقی ہے کیا ابھی کوئی حسرت گناہ کی — دل کیوں نہیں شریک مرے انفعال میں

○

اس طرح ہوں قیدیِ حالات بسملؔ جس طرح — شیر ہو پنجرے میں یا شاہِ ظفر رنگون میں

○

خندہ بی سے بسملؔ آہ، قلبِ فسردہ خوش ہوگیا — شمعِ مزار جس طرح قبر میں روشنی نہ دے

○

کب تک فریب خوردۂ انساں رہیں گے ہم — اب اپنے سائے سے بھی گریزاں رہیں گے ہم

○

ناامیدی ہے بری چیز مگر — ایک تسکین سی ہو جاتی ہے

○

عبادتوں کے لیے فرصتیں ہیں لوگوں کو — ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

بسملؔ صاحب کی غزلوں کی طرح اُن کی کئی نظموں میں بھی طنز اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ "انسان" "ماتمِ انسانیت" "جنگ" "سرکار خفا ہیں" "آتی ہے ہر طرف سے آواز..." "روئے سخن" "منسٹر ہو جانے پر" "سیاسی یزید" "خلیفۃ الارض" "اندوہِ عظیم" وغیرہ میں طنزیہ عنصر حاوی ہے۔ رباعیات و قطعات میں بھی بہترین طنز کے نمونے نظر آتے ہیں لیکن بحیثیتِ مجموعی میں مخمور سعیدی کے اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں کہ "وہ صنفِ سخن جس میں بسملؔ صاحب کی داخلی شخصیت کا بھرپور اظہار ہوا ہے اور جس کے آئینے میں اُن کے انفرادی خط و خال اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ نما ہوئے ہیں، غزل ہی ہے" خود بسملؔ صاحب کو بھی اعتراف ہے:

مری شاعری خلطِ مبحث نہیں ہے — محبت کی رُوداد ہے اور میں ہوں

بسمل صاحب کی غزل میں عشق وحسن کے رنگارنگ تجربات، بھرپور تغزل، احساس جمال، نفسیاتی پیچیدگی کا عکس، فعالیت، غم سے لطف اندوز ہونے کی سکت، اشاریت اور رمزیت، تیکھاپن، تہہ داری، نازک خیالی اور محسوسات کی ترجمانی ہے مختلف مقامات پر طنز کی آمیزش سے اُن کی شاعری میں بڑے دلکش شیڈز (SHADES) نمودار ہوتے ہیں جو ایک خاص کیفیت سامع کے دل میں پیدا کرتے ہیں۔ بسمل صاحب بسا اوقات تجاہل عارفانہ اور دیگر شاعرانہ کے وہ اسالیب بیان نہایت کامیابی کے ساتھ اختیار کرتے ہیں جن کے لیے مومن مشہور ہے۔ اکثر اوقات تو وہ اس رنگ میں مومن کے اتنے نزدیک پہنچ جاتے ہیں کہ اُن کے شعر پر مومن کے شعر کا دھوکا ہوتا ہے میرا خیال ہے سو پچاس سال بعد اگر اُردو زندہ رہی تو بسمل اور مومن کے ہم رنگ اشعار محققین کے درمیان مباحث کے موضوع بن سکتے ہیں۔ ذرا یہ شعر دیکھیے:

کون ہے جو نہیں زمانے میں — کس سے شکوہ کریں زمانے کا

○

آہ کا کیوں اثر نہیں ہوتا — دردِ دل، دردِ سر نہیں ہوتا

○

دیکھیں گے کیا کسی کو اب اپنی نگاہ سے — خود کو بھی دیکھتے ہیں تمھاری نظر سے ہم

○

غلط سمجھ کے نہیں دیکھتا ہوں تیری طرف — یہ دیکھتا ہوں کہ اندازِ گفتگو کیا ہے

○

وہ ہر ادا میں عرضِ تمنا سے بے نیاز — میں ہر نظر میں عرضِ تمنا لیے ہوئے

○

یقیں نہ آئے، کسی اور کی طرف سے مجھے — اگر سنائے کوئی مجھ کو داستاں میری

○

ہوا ہوگا وہ شادی مرگ فرطِ شادمانی سے — خوشی کیا ہو مجھے دشمن کی مرگِ ناگہانی سے

○

مجھ کو ہر ظلم گوارا ہے تمھارا لیکن — یہ گوارا نہیں، کہتی ہے جو دنیا تم کو

وہ کچھ اس طرح مجھ کو دیکھ کر مُنہ پھیر لیتے ہیں
کہ جیسے میری حالت واقعی دیکھی نہیں جاتی

پاس رہتا ہے دُور رہتا ہے
دھیان میں وہ ضرور رہتا ہے

دل جو رہتا تھا اپنے پاس کبھی
وہ بھی اب دُور دُور رہتا ہے

تھی کاہشِ فراق ابھی کیوں وصال میں
کیا تم چلے گئے تھے کسی کے خیال میں

زندگی کو سنبھال کر رکھیے
زندگی موت کی امانت ہے

موت آزاد کیے دیتی ہے اک اک کر کے
کچھ خبر بھی ہے تمھیں، اپنے گرفتاروں کی

جو جہاں ہے وہیں تجھ سے ہے قریب
ہے کمالِ انجمن آرائی کا

عشقِ ادا شناس ہے رمزِ تغافل آشنا
آئی ہے اب خصوصیت آپ کے التفات میں

یاد کرتا ہوں تجھے میں جس وقت
کیا تجھے بھی مری یاد آتی ہے

یوں چشمِ التفات نے مارا کہ ہائے ہائے
ایسا گرا ہوں لے کے سہارا کہ ہائے ہائے

بیٹھا نہیں ہوں سایۂ دیوار دیکھ کر
ٹھہرا ہوا ہوں وقت کی رفتار دیکھ کر

بہت شاد ہوتی ہے اب جب طبیعت
تو کچھ دیر رونے کو جی چاہتا ہے

میں کیا کروں نیاز ہی مجھ کو پسند ہے
حالانکہ آستانے سے سجدہ بلند ہے

ہر صاحبِ نظر سے جدا ہے معاملہ
پردے پڑے ہوئے ہیں وہاں اعتبار کے

نگاہوں میں چلتے ہیں سب کام اُن کے
بہت سخت جن کی نگہبانیاں ہیں

ان اشعار کی متغزلانہ کیفیت، موضوعاتِ حسن و عشق، کنایاتی انداز اور طرز سے متعلق اُن خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، اگر مجھ سے بسمل سعیدی کے شاعرانہ مرتبے کی بابت سوال کیا جائے تو میں انھیں عہدِ حاضر کا مومن کہوں گا۔

سید فضل المتین

کچھ یادیں، کچھ باتیں

میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ آزادیٔ وطن کے کچھ عرصے بعد گورنمنٹ کالج اجمیر کے ایک آل انڈیا مشاعرہ میں شرکت کے لیے ٹونک سے شعراء کا ایک گروپ آیا تھا۔ استاد صولت ٹونکی، بسمل سعیدی، افق اجمیری، زاغ ٹونکی اور فاخر اعجازی اس گروپ میں شامل تھے۔ مشاعرہ کے دو روز مجروح سلطانپوری اور دیگر شریک مشاعرہ شعراء کے ساتھ یہ حضرات عم محترم مولینا معنی اجمیریؒ سے ملنے کے لیے بیت المعنی تشریف لائے تھے۔ بسمل صاحب نے جو غزل سنائی تھی اس کا ایک شعر آج بھی حافظے میں محفوظ ہے۔

کعبے میں مسلمان کو کہہ دیتے ہیں کافر بت خانے میں کافر کو بھی کافر نہیں کہتے

بسمل صاحب کے پڑھنے کا خاص انداز اور شعر پڑھتے وقت ان کے چہرے کا خاص اتار چڑھاؤ مجھے آج تک یاد ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے بسمل صاحب کو دیکھا اور میں ان سے متاثر ہوا، ورنہ ان کا نام اور ان کا کلام برابر سنتا رہا تھا۔ افق اجمیری جب ٹونک سے اجمیر آتے بسمل صاحب کے [illegible] رہتے اور مولینا معنی اجمیریؒ خاص طور پر بسمل صاحب کا حال دریافت کرتے۔ مولینا معنی اجمیریؒ سے ان کے بڑے پر خلوص مراسم تھے۔ مجھے یاد ہے۔ نومبر ۷۶ء میں میرے سفر دہلی کے وقت جب اچانک [illegible] بسمل صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ تو مولینا معنی اجمیریؒ کے ذکر کے وقت بسمل صاحب کی آنکھیں اشک آلود تھیں۔ ہوا یہ کہ میں اور مخمور صاحب اردو بازار سے دریا گنج (دفتر تحریک) کی جانب جا رہے تھے اور بسمل صاحب اردو بازار کی جانب آ رہے تھے کہ اچانک افضل پشاوری کی ہوٹل کے قریب بسمل صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ بسمل صاحب، جوش ملیح آبادی سے ملنے جا رہے تھے۔ جو اس وقت پاکستانی شہری کی حیثیت سے دہلی آئے ہوئے تھے۔ اور آزاد ہند ہوٹل میں مع اپنی رفیقۂ حیات کے مقیم تھے۔ بسمل صاحب سے دراصل یہ میری پہلی ملاقات تھی اور یہ پہلا تعارف۔ اس سے پہلے میں نے ان کو صرف دیکھا اور سنا تھا اور وہ بھی

دوست، لیکن اب میں ان کے روبرو کھڑا تھا اور مخمور صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا تھا۔ کچھ دیر ان سے تبادلۂ خیال کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا معنی اجمیری کے وسیلے سے وہ جلد پہچان گئے تھے۔ محبت و شفقت سے ملے تھے اور یہ جان کر خوش ہوئے تھے کہ میں بھی شعر کہتا ہوں۔ اس وقت کے بسمل صاحب اور ۱۹۔۲۰ سال پہلے کے بسمل صاحب میں نمایاں فرق تھا۔ زمانہ کے سرد و گرم نے بسمل صاحب جیسے سرخ و سپید چہرے مہرے والے بلند قامت شاعر کو جھلسا دیا تھا، سکوڑ دیا تھا۔ وہ آواز جو بہت پہلے "بیت المعنی" میں سنی تھی اپنی گرج کھو چکی تھی مگر اس آواز کا وزن اور وقار برقرار تھا۔ چہرے کی پہلی سی شگفتگی باقی نہ تھی، مگر متجسس آنکھوں کی ذہانت وہی تھی، روشن کشادہ پیشانی کی چمک وہی تھی۔ اور قد کی اونچائی اب بھی یہ کہہ رہی تھی کہ ہم سربلند ہیں۔ نمایاں ہیں، ممتاز ہیں۔ ماہ و سال کی گرد نے اگر ہمارے نقوش دھندلا دیے تو کیا ہوا، ہمارا وجود سلامت ہے۔ ہم حالات سے مقابلہ کرنا جانتے ہیں۔ یہ مختصر ملاقات بڑی متاثر کن تھی۔ اس ملاقات کی دین وہ نظم ہے جو اگلے صفحات میں شریک اشاعت ہے۔

عرض کرنا یہ ہے کہ میرے بسمل صاحب سے کوئی خاص مراسم نہیں ہیں۔ صرف ایک بار انکو دیکھا اور سنا ہے اور ایک بار گفتگو کی سعادت ملی ہے۔ مگر وہ شاعر! جس نے ایسے یادگار اشعار کہے ہوں اسے پڑھنے اور جاننے کو کس کا دل نہ چاہے گا۔

مجھ سے عہدِ وفا وہ کیوں چاہیں حسن، خود عشق کی ضمانت ہے

محبت، اے معاذ اللہ محبت، دم نکل جائے
اگر محسوس بھی اتنی ہو، جتنی دل میں ہوتی ہے
پرستش کر، محبت کرنے والوں کی پرستش کر
خدا ہوتا ہے دل میں، جب محبت دل میں ہوتی ہے

کب سے الجھ رہے ہیں درِ والسیر، سے ہم
دو تار تک تو کھینچ لو تری آستیں سے ہم
ہوگا تمھارا نام ہی عنوانِ ہر ورق
اوراقِ زندگی کو الٹ دیں کہیں سے ہم
دہرائی جا سکے گی نہ اب داستانِ عشق
کچھ وہ کہیں سے بھول گئے ہیں کہیں سے ہم

ان وقت کے ساتھیوں سے اپنی　　　کس طرح نباہ ہو گئی ہے
اٹھتی ہی نہیں کسی طرف اب　　　مایوس نگاہ ہو گئی ہے
اے وقت نہ پوچھ تیرے ہاتھوں　　　کیا چیز تباہ ہو گئی ہے

حد بھی کوئی انتظار کی ہے　　　اب چاندنی دھوپ ہو چلی ہے

اچھے شعر کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ ایک بار سنا جائے اور یاد ہو جائے اور یہ واقعہ ہے کہ اشعار مندرجہ بالا، جب پہلی بار میری نظر سے گذرے اسی وقت سے ایک تاثر قائم کیے ہوئے ہیں اور مجھے یاد ہیں۔ اسی لیے بغیر کسی کاوش کے میں نے یہ یادگار اشعار جو شاعر کی پہچان کے لیے کافی ہیں، تحریر کر دیے ہیں۔ چند اشعار سے شاعری مکمل اور صحیح پہچان ممکن نہیں ہے، مگر ایک رائے اور وہ بھی صحیح رائے قائم کرنے کی راہ تو ملتی ہے۔ ایک شعر ؎

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

نے ایک شاعر کو آج تک زندہ رکھا ہے۔

بسمل صاحب کی زندگی کا دائرہ ریاستی اور جاگیرداری سماج سے لے کر آج کے سماج کے جمہوری اور عوامی دور تک نظر آتا ہے اور یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بسمل صاحب پر آج بھی ریاستی اور جاگیرداری سماج کی اعلیٰ قدروں کی گرفت مضبوط ہے۔ ایک مخصوص گروہ نے اپنے سیاسی اغراض و مفادات اور اپنے سیاسی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے ریاستی اور جاگیرداری سماج کو مسلسل دشنام طرازیوں کا ہدف بنایا ہے، جس سے اس کا چہرہ اس قدر داغدار اور گھناونا ہو جائے کہ اسے اس کی اپنی شکل میں پہچانا مشکل ہو جائے۔ مان لیا کہ ریاستی اور جاگیرداری سماج میں ہزار خرابیاں تھیں مگر وہ اپنے کچھ روایات بھی رکھتا تھا جن سے محروم ہو کر ہم آج بے اعتمادی اور بے یقینی کی زندگی جی رہے ہیں۔ بقول محمود سعیدی:

اس سماج کی ایک نمایاں خوبی اس کے ذہین افراد کا یہ اخلاقی وصف تھا کہ وہ اپنے اپنے شعبۂ کارکردگی میں انتہائی ذمہ دار، مخلص اور ایثار شعار ہوتے تھے جب کسی شخص نے اپنے لیے کسی ایک پیشے یا کسی ایک فن کا انتخاب کر لیا تو پھر بیگانۂ مصلحت ہو کر اسی کے منطقی تقاضوں کی تعمیل و تکمیل کو اپنی زندگی کا اول و آخر مقصد قرار دے لیا۔ نئے زمانے کے لوگ اسے جنون کا نام دے سکتے ہیں۔

لیکن دراصل یہ ایک طرح کا ذہنی جہاد تھا جس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بڑی سخت آزمائشوں سے گذرنا پڑتا تھا۔ یہ آزمائشیں کتنی سخت ہوتی تھیں اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے۔ کہ خود اس زمانے میں بھی اہلِ فن کے اس عقیدۂ ترکِ ماسوا کے لیے جنون و خبط جیسی اصطلاحات ہی وضع کی گئی تھیں لیکن اس وقت معاشرے میں اس کے لیے ایک خاص قسم کا احترام اور تپاک پایا جاتا تھا جو اہلِ فن کا حوصلہ بڑھاتا تھا اور وہ اور بھی زیادہ سرگرمی اور لگن کے ساتھ تکمیلِ فن کی مہم سر کرنے میں منہمک ہو جاتے تھے۔ اہلِ فن کی وضع جنون کا یہ احترام اب باقی نہیں رہا ہے

اور جہاں تک بسمل صاحب جیسے غیور شاعر کا تعلق ہے، انھوں نے ذمہ داری کے ساتھ اپنے احساسات کی دولت کی حفاظت کی ہے اور اظہارِ احساسات میں کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئے ہیں۔ انھوں نے جاگیرداری دور کی عام روش یعنی قصیدہ گوئی کے برخلاف نہایت واضح اور صاف طریقہ پر اس نظام کے بدنما مظاہر پر روشنی ڈالی ہے اور اس نظام کی غلط کاریوں کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ ان کی غزلوں کے اکثر اشعار اس کی گواہی دیں گے اور اگر غزل کے اشعار کی شہادت ناقابلِ قبول ہو تو پھر "سرکار خفا ہیں"، "ڈپٹی کمشنر انگواٹری"، "کاشتکار" اور "جنازہ" وغیرہ نظموں کو ثبوت کے لیے پیش کیا جاسکتا ہے۔

بسمل صاحب اور جاگیرداری سماج کے تعلق کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ بسمل صاحب کی رگوں میں جو خون گردش کر رہا ہے وہ ان غیور حریت پسندوں کا ہے جو ہندوستان کی مشہور تحریک جہاد سید احمد شہید بریلوی کے ہمنوا تھے۔ بسمل صاحب نے جن لوگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں اور جن کی گود میں پرورش پائی ہے وہ سرفروش تھے مصلحتِ وقت کے آگے سپر ڈالنے والے نہ تھے۔ وہ ایک مقصدِ حیات رکھتے تھے اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے زندگی بسر کی تھی انسان اپنے ماحول کے اثرات قبول کرتا ہے۔ اپنے خاندانی ماحول کے اثرات اور روایات کی بنا پر بسمل صاحب ہرگز وہ راہ نہیں اپنا سکتے تھے۔ جو خوشامدی درباریوں کے لیے لازمی ہے۔ انھوں نے نوابوں کی صحبت میں ضرور وقت گذارا ہے۔ مگر ان کی ادبی مجالس کے حاشیہ نشین نہیں شمع محفل رہے ہیں۔

بسمل صاحب کی شاعری اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ

ان کا خاندان ولی اللہی طرزِ فکر کا نمائندہ رہا ہے اور یہ وہ طرزِ فکر ہے جس نے اپنے دور میں تقلید جامد کی مخالفت کے ساتھ مختلف مدرسہ ہائے فکر میں ایک طرح کا تال میل پیدا کرنے کی کوشش کی تھی یہ طرزِ فکر اجتہاد کی دعوت دیتا تھا مگر جوشیلی جارحیت کے ساتھ نہیں، تعمیر کے جذبہ ہوشمندی کے ساتھ یہ طرزِ فکر ایک ایسی تحریک کا بانی ہوا جس کا مقصد حقیقی دراصل غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جہاد کرنا اور ہندوستان کے عوام کو ان پر غالب کرنا تھا۔ حکمران چالاک تھا۔ اس نے اپنی حکمتِ عملی سے اس تحریک کی عملی قوت کو ایک نیا رخ دیا اور یہ تحریک جو دراصل ایک مشترکہ دشمن کے خلاف تھی بالآخر آپس ہی کی لڑائی میں ضائع ہو گئی۔ اور آج صورتِ حال یہ ہے کہ اس تحریک کے سلسلے میں ہمارے یہاں جو مواد ہے، جو ماخذ ہیں وہ اپنی اصلی شکل و صورت نہیں رکھتے ہیں انھیں تحریف اور ترمیم کے ذریعہ غیر مستند اور غیر کارآمد بنا دیا گیا ہے۔ بہرحال یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ یہ تحریک ہندوستان کی پہلی عوامی جنگ آزادی تھی اور ۱۸۵۷ء میں جو کچھ ہوا وہ اس تحریک ہی کی دین تھا۔ بسمل صاحب کو ولی اللہی طرزِ فکر ورثہ میں ملا۔ اور یہ طرزِ فکر ایک عملی زندگی اور زندگی کی ترجمان شاعری میں ان کا ممد و معاون بنا یعنی انھوں نے اجتہاد کی راہ اختیار کی ہے۔ شعور، اعتدال و توازن ان کے ہم راہ رہے ہیں۔ وہ گوارا نہ تقلید سے دامن کشاں نظر آتے ہیں مگر روایت سے ان کا رشتہ بہرحال برقرار رہتا ہے۔

بسمل صاحب کی شاعری نے دارالسلام ٹونک میں آنکھ کھولی۔ یہ وہیں پروان چڑھی اور اس نے وہیں اپنا حقیقی رنگ اختیار کیا۔ جب بسمل صاحب کی شاعری کا آغاز ہوا تو ٹونک کی ادبی مجالس میں مومن سکۂ رائج الوقت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور مومن کی نازک خیالی۔ انتخاب الفاظ اور اسلوبِ شاعری کو معیارِ سخن سمجھا جاتا تھا۔ مومن کے بعد ٹونک میں جن شعرا کا جادو چلا وہ حسب ترتیب یہ ہیں۔ استادِ جہاں داغ، ظہیر دہلوی، انور دہلوی، بسمل خیرآبادی، مضطر خیرآبادی اور آرزو لکھنوی وغیرہ۔ یہ وہ شعرا ہیں جن کا کلام الفاظ کی دلبست، نزاکت خیال، معنی آفرینی، لہجہ کی شائستگی، زبان کی شوخی اور صحت و نفاست کے خیال سے اپنی ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ ناممکن تھا کہ بسمل صاحب اپنے ادبی ماحول کے تقاضوں سے بے خبر رہتے اور ان مطالبات کو پورا نہ کرتے جو ماحول ان سے چاہتا تھا۔ بسمل صاحب کے کلام کے مطالعے سے ایسا لگتا ہے کہ بسمل صاحب نے اپنے ادبی ماحول پر اثر انداز شعرا میں دو اہم شعرا، مومن اور داغ کا اثر قبول کیا اور ان کے اسلوب و ادا کی راہ کو اپنی شاعری

کی منزل قرار دیا۔

بسمل صاحب نے اصنافِ سخن میں سے غزل، نظم اور رباعی کو اپنے لیے منتخب کیا۔ یہ اصناف ان کے مزاج سے مناسبت بھی رکھتی ہیں۔ جہاں تک ان اصناف پر قدرت اور فنی مہارت کا سوال ہے بسمل صاحب نے حق ادا کر دیا ہے۔ بسمل صاحب ایک استادِ فن ہونے کے ساتھ دیدۂ بیدار اور دلِ زندہ بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے ایک ہوشمند حساس شاعر کی حیثیت سے اپنی شاعری کو قدیم و جدید کے امتزاج سے اس اعلیٰ معیار تک پہنچایا ہے جس کی کامیاب مثال اردو شاعری میں آسانی سے کہیں اور تلاش کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔ ان کے یہاں پختگی کے ساتھ شگفتگی اور تازگی ہے۔ وہ فنی معیاروں کے دائرہ سے قدم باہر نہیں رکھتے مگر رسمیت کے اسیر نہیں۔ ان کے آہنگ میں کلاسیکی اردو شاعری کی روایات کی گونج ہے مگر ان کے اپنے جذبات و احساسات کی نغمہ آفرینی کے ساتھ ہے۔ اس لیے ان کی آواز آج کے شاعر کی معتبر آواز معلوم ہوتی ہے۔

بیسویں نظم، نظم اور رباعی کے مقابلہ میں بسمل صاحب کی غزل کی زیادہ اہمیت ہے۔ ابھی بسمل صاحب کی غزل کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کیا گیا ہے۔ ان کی غزل اس نظر کی متلاشی ہے جو اسے پہچان سکے۔

غزل، واردات، کیفیات اور محسوسات کا وسیلۂ اظہار ہے۔ اور بسمل صاحب کی شاعری تمام تر واردات، کیفیات اور محسوسات ہی سے عبارت ہے۔ اس لیے ان کی غزل، ان کا وہ وسیلۂ اظہار ہے جہاں وہ ہر طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ کامیابی ان کی غزل کے لیے ایک مخصوص ماحول پیدا کرتی ہے اور اس مخصوص ماحول کی نشاندہی وہ الفاظ اور موضوعات کرتے ہیں جو بسمل صاحب کی غزل میں اپنا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ پیمانہ۔ شراب۔ عقل۔ عشق۔ کعبہ۔ مسجد۔ صنم خانہ۔ عبادت۔ ترکِ دنیا۔ بندگی۔ گناہ۔ وقت ان کی غزل میں ایک مخصوص معنی میں آتے ہیں اور موضوعِ فن بن کر آتے ہیں اور اس معنوی فضا کی تخلیق کرتے ہیں جس سے ان کی غزل کا مخصوص ماحول پیدا ہوتا ہے۔ اور ان کی آواز کا منفرد نقش قایم کرتا ہے۔ مخصوص الفاظ اور موضوعات کے ساتھ ان کے انفرادی لہجے کی تشکیل میں ان خارجی موضوعات کا بھی دخل ہے جنھیں بسمل صاحب اپنے احساسات کا جز بنا لیتے ہیں۔ احساس اور وہ بھی شدّتِ احساس بسمل صاحب کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔

بسمل صاحب اپنے منفرد مزاج اور اس کے مخصوص تقاضوں کو خیرباد کہنے پر قادر

نظر آتے ہیں نہ آمادہ اور اس کی سزا بھی انکو معاشرے سے ملی ہے مگر وہ ہمت نہیں ہارے اور انھوں نے اپنی ایک وضع جنوں برقرار رکھی۔ اسی وضعِ جنوں اور اپنے مزاج کی پاسداری نے ان کی شخصیت کی تعمیر کی ہے۔ اس شخصیت کی جس کا اظہار ان کی غزل میں ہوا ہے۔ اور جس سے ان کی غزل اپنا ایک مخصوص ماحول بناتی ہے۔

غزل گردن زدنی ہو یا شاعری کی آبرو، بہرحال وہ ایک ایسا کامیاب وسیلۂ اظہار ہے جس کے ذریعہ ذات و کائنات کے تمام مسائل کی ترجمانی ہوتی ہے۔ دیگر کامیاب غزل گو شعراء کی طرح بسمل صاحب نے بھی یہ ثبوت فراہم کیا ہے اور اردو کے غزل گو شعراء میں یقیناً ان کا نام نمایاں طور پر آئے گا۔

جس شاعر کے یہ دم خم ہوں:

بدل جاتی ہیں جب ہم سے نگاہیں شادمانی کی
ہمیں ناشادمانی میں بسر کرنا بھی آتا ہے
بچاتے ہیں نگاہیں خاک کے ذروں سے بھی لیکن
ہمیں افلاک پر نقد و نظر کرنا بھی آتا ہے

اور جس کی نظر میں زمانہ کی حقیقت یہ ہو:

زمانہ کیا ہے تمھاری نظر کا عالم ہے

وہ زمانہ اور زمانے کے سطحی تقاضوں کے آگے کس طرح اعترافِ شکست کر سکتا ہے

جس شاعر کا اندازِ فکر اور آرزو ایسی صالح اور صحت مند ہو:

کبھی اے آفتاب ایسی بھی کوئی صبح پیدا کر
صدا ناقوس کی سن کر حرم بیدار ہو جائے

اسے وہ ہندوستان کیسے فراموش کر سکے گا۔ جہاں ناقوس و اذاں کی صدائیں ایک ساتھ بلند ہوتی ہیں اور مسائل پیدا کرتی ہیں۔

بنواری لال

بسمل سعیدی اور ان کی شاعری

میں میدانِ سیاست کا ایک چھوٹا سا کھلاڑی سوچتا ہوں کہ جناب بسمل سعیدی کے بارے میں کیا لکھوں۔ لیکن برادر گرامی مخمور سعیدی صاحب اور ان سے زیادہ خود میرا خلوص اور عقیدت مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ کچھ نہ کچھ اظہارِ خیال کروں۔

بسمل صاحب سنہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے اب وہ ۷۵ سال کے ہیں اور ان کی شاعری کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہے۔ جس ماحول میں انھوں نے آنکھ کھولی وہ آسائش کا دور تھا۔ زندگی اتنی الجھی ہوئی نہ تھی جتنی کہ آج ہے۔ بسمل صاحب کے اس دور کے کلام میں عشق و محبت کے جذبات کی فراوانی ہے۔ حسن کے تذکرے ہیں۔ زندگی کے مسائل بھی ہیں لیکن ان میں اتنی الجھنیں نہیں۔ جیسے جیسے حالات بدلتے گئے بسمل صاحب کے کلام میں بھی تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ لیکن انھوں نے شاعری کی بنیادی قدروں کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ بسمل سنہ ۴۷ء کے بعد دہلی تشریف لے گئے اور اب مستقل طور پر وہیں قیام پذیر ہیں۔ اہلِ ٹونک نے اس زمانے میں ان کی خاطر خواہ قدر نہ کی مگر باہر والوں نے انھیں پہچانا اور ان کو وہ مقام دیا جو ان کا حق تھا۔ بسمل صاحب کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن بدقسمتی سے میں صرف ان کا چوتھا مجموعہ اوراقِ زندگی ہی دیکھ پایا ہوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان کی شاعری قدیم و جدید کا امتزاج ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ پہلے مصرعے کے الفاظ کو لوٹ کر دوسرے مصرعے میں ڈھال دینا اور اس طرح کہ پڑھنے والا دنگ رہ جائے ان کی روش خاص ہے۔ بسمل صاحب کا مطالعہ وسیع ہے۔ اس لیے کلام فنی اغلاط سے یکسر پاک ہے۔ اشعار میں گہرائی اور گیرائی دونوں ہی پائی جاتی ہیں۔ طنز کرتے ہیں تو بڑی خوبصورتی کے ساتھ۔ کہیں زندگی اور اس کے علائق سے گریز کرتے ہیں تو کہیں زمانے کو للکارتے نظر آتے ہیں۔ اور یہ ایک فطری چیز ہے۔ انسان کا دل اور پھر شاعر کا دل گردشِ

کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج کے دور میں جس قدر عیش و عشرت کے سامان دولت کی ریل پیل کی وجہ سے ہوتے جا رہے ہیں انسان سکونِ روح سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ آج کا میکانیکی دور اس سکون کو نہیں خرید سکتا جو سادہ زندگی میں پوشیدہ تھا :

فراہم جس قدر عشرت کے ساماں ہوتے جاتے ہیں ۔۔۔ سکونِ روح سے محروم انساں ہوتے جاتے ہیں

وہ اس خوشی کے بھی قائل نہیں جو کسی ناشاد کے غم سے حاصل ہو۔ دراصل یہ سماج کی خود غرضی پر بہت بڑا طنز ہے :

خوشی کے نام سے نفرت ہے جب سے ہم یہ سمجھے ہیں ۔۔۔ کہ بنتی ہے کسی ناشاد کے غم سے خوشی اپنی

شاید اسی لیے بسمل صاحب نے اپنے دل کو محرمِ غم بنا لیا ہے۔ وہ خوشی جو دوسروں کے غم سے ملے اور عارضی بھی ہو، اسے وہ لائقِ ماتم ٹھہراتے ہیں :

اس طرح دنیا میں دل کو محرمِ غم کیجیے ۔۔۔ جب خوشی کوئی میسر ہو تو ماتم کیجیے

بسمل صاحب کو اس کا شدت سے احساس ہے کہ انسانیت کے سچے رہنما اب کہیں نہیں رہے زندگی کا قافلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے آفات کے ریگزاروں میں مگر میر قافلہ نہیں ملتے ... لوگ بھٹک رہے ہیں ۔ مگر راہ دکھانے والا نہیں ۔ اور راہ دکھانے والا خود ہی ریگزاروں میں بھٹک کر رہ گیا ہو تو پھر ؟

جن کو دعوے تھے رہنمائی کے ۔۔۔ کھو گئے خود وہ رہگزاروں میں

زمانہ اتنا بدل گیا کہ اپنے بھی بیگانے نظر آنے لگے ان کو پہچاننا بھی دشوار ہو گیا۔ ذیل کے شعر میں ہمارے موجودہ معاشرے پر بہت بڑا طنز ہے۔ فرماتے ہیں :

پہچاننا اب ان کو دشوار ہو گیا ہے ۔۔۔ جو لوگ اپنے جانے پہچانے رہ گئے ہیں

بسمل صاحب غزل کے مزاج داں ہیں، جو کچھ کہتے ہیں اس میں غزل کا رنگ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ یہ چند شعر دیکھیے :

بدل جاتی ہیں جب ہم سے نگاہیں شادمانی کی ۔۔۔ ہمیں ناشادمانی میں بسر کرنا بھی آتا ہے

بہار کیا ہے چمن کی اک آرزوئے طرب ۔۔۔ خزاں چمن کی اسی آرزو کا ماتم ہے

محبت اے معاذاللہ محبت، دم نکل جائے ۔۔۔ اگر محسوس بھی اتنی ہو جتنی دل میں ہوتی ہے

چھانتے ہیں خاک اس منزل کی اہلِ جستجو ۔۔۔ آج میرے کارواں کی گرد جس منزل میں ہے

قفس میں جو ہوا کے سرد جھونکے آتے رہتے ہیں ۔۔۔ الٰہی کیا بہاریں اب بھی آتی ہیں گلستاں میں

پہنچے نہ آہ لے کے قفس کی اداسیاں ___ یارب ہوا کا رخ نہ سوئے آشیاں رہے
اے شمعِ صبحِ محفل ان کو جلا کے بجھنا ___ دو چار اور تیرے پروانے رہ گئے ہیں
ان ابروؤں کی چھاؤں میں رقصاں ہیں آج تک ___ وہ جنبشیں کہ جن سے زمانے بدل گئے
کبھی اے آفتاب ایسی بھی کوئی صبح پیدا کر ___ صدا ناقوس کی سن کر حرم بیدار ہو جائے
یہ عشق جرم بھی ہے لائقِ سزا بھی ہے ___ سزا کی حد بھی مگر کوئی انتہا بھی ہے

غزل بسمل صاحب کا خاص فن ہے۔ اپنی پچاس سالہ شاعری میں انھوں نے بے شمار غزلیں کہی ہیں لیکن ان کی نظموں کی تعداد بھی کافی ہے۔ اور نظموں میں بھی ان کا جذبہ اور خلوص صاف جھلکتا ہے۔ وہ خواہ مخواہ کے نعرے لگانے والے یا کھوکھلے الفاظ کا استعمال کرنے والے شاعر نہیں ہیں۔ وہ وہی صفحۂ قرطاس پر لاتے ہیں جو کچھ ایمانداری سے محسوس کرتے ہیں۔ 'انسان' اور 'ماتمِ انسانیت' ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ نظم 'انسان' میں فرماتے ہیں :

اقوال کی دنیا میں ہے فردوس کا طالب ___ اعمال کی دنیا سے گریزاں ہے ابھی تک
آباد ہے اس نام سے ہر ذرہ زمیں کا ___ دنیا مگر انساں سے ویراں ہے ابھی تک

'ماتمِ انسانیت' میں بھی کچھ اسی طرح کے تاثرات ہیں :

اب نہ پھولوں میں وفا کی بو نہ رنگ اخلاص کا ___ تجھ کو اے آب و ہوائے گلستاں کیا ہو گیا

'نعرۂ جمہوریت' میں ملک کو آزادی ملنے پر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہ جذبات ایک محب وطن کے قلم سے ہی نکل سکتے ہیں :

مدتوں کم بخت اسیرِ باغِ ہندستاں رہی ___ اب جہاں چاہے چلی جائے خزاں آزاد ہے

بسمل صاحب نے مختلف مذاہب کی خدمت میں بھی عقیدت کے پھول پیش کیے ہیں جس سے ان کی وسیع المشربی اور رواداری ظاہر ہوتی ہے۔ نظم 'ہولی' کا یہ بند بسمل صاحب کی کئی نظمیں ہیں جو تفصیلی مطالعے کا تقاضا کرتی ہیں مگر یہ چند سطور مضمون کی شکل پہلے ہی اختیار کر چکی ہیں۔ اس لیے اتنا ہی اور کہنا چاہوں گا کہ بسمل صاحب ایک شاعر ہی نہیں، ایک انجمن ہیں۔ شاعری کی ہر معروف صنف میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور کامیاب رہے ہیں۔ خدا سے میری دعا ہے کہ وہ زندہ و تندرست رہیں تاکہ ان کے علم کی چھاؤں میں اہلِ ذوق کا کارواں پناہ لیتا رہے۔ ٹونک کی یہ جگمگاتی جوت جلتی رہے روشنی دیتی رہے۔ علم کی ختم نہ ہونے والی روشنی۔

(صاحبزادہ) شوکت علی خاں

اوراقِ زندگی پر ایک نظر

مجھے حضرتِ صولت ٹونکی مرحوم سے بڑی عقیدت تھی۔ حضرتِ بسمل سعیدی ان کے قریبی دوستوں میں رہے ہیں اور میرے دل میں ان کے لیے بھی بڑی قدر و منزلت ہے۔ بسمل صاحب کے کلام کا چوتھا مجموعہ "اوراقِ زندگی" کے نام سے شائع ہوا تو برادرِ محترم مخمور سعیدی صاحب نے ایک طویل خط لکھ کر مجھ سے اظہارِ خیال کی خواہش کی۔ اسے حُسنِ اتفاق کہیے کہ جس روز مخمور صاحب کا یہ خط مجھے ملا اسی روز انھیں بھی میرا خط ملا جس میں میں نے خود یہ خواہش کی تھی کہ میں بسمل صاحب کے فکر و فن پر اپنی معروضات پیش کروں۔

"اوراقِ زندگی" ایک دردمند انسان اور ایک حسّاس شاعر کے اُن شب و روز کی داستان ہے جن کا ہر لمحہ 'نشاطِ غم' کی کیفیات اور 'کیفِ الم' کے تجربات سے بہرہ ور رہا ہے شاعر نے اپنے لمحے لمحے کے 'مشاہدات' کو ان اوراق پر مرتسم کر دیا ہے۔ محسوسات و مشاہدات کی یہ نقش گری اسی وارفتگی کے انداز میں ہوئی ہے جو شاعرانہ مزاج کا خاصہ ہوا کرتی ہے۔ فنّی شعور نے اسے اور جِلا بخش دی ہے۔ اب ان نقوش کا جلوۂ صد رنگ ذہن و ذوق دونوں کے لیے سامانِ صد ہزار چراغاں لیے ہوئے ہے۔

بسمل صاحب کی شاعری میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کی کارفرمائی صاف جھلکتی ہے۔ خود ان کی زندگی بھی اسی امتزاج سے عبارت ہے اور ان کی شاعری ان کی زندگی کی ترجمان رہی ہے لیکن یہ ترجمانی اس انداز میں ہوئی ہے کہ جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے۔ حسن و عشق کے معاملات ہوں یا کاروبارِ حیات کے مسائل، بسمل صاحب نے اپنے واردات اور اپنے تجربات کو اس فنی اسلوب میں پیش کیا ہے کہ ان میں ایک ہمہ گیری کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ تخیل کا یہ کمال ہمیشہ اچھی شاعری کی پہچان رہا ہے۔

بسمل صاحب ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے والد حکیم سید سعید احمد صاحب اسعد ایک جلیل القدر عالم اور پختہ مشق شاعر تھے۔ شاعری کا ورثہ بسمل صاحب کو انہی سے ملا ہے۔ اپنے ایک مقطعے میں فرماتے ہیں:

بسمل بیاضِ شعر ہے فردوسِ رنگ و بو　　جاری ہے فیضِ اسعدِ خلد آشیاں سے کیا

اپنے والدِ مرحوم سے ان کی عقیدت کی ترجمان ان کی نظم "برسی" بھی ہے جو انھوں نے حکیم صاحب مرحوم کی پہلی برسی کے موقعے پر کہی تھی۔ یہ نظم حفیظ جالندھری کی رائے کے ساتھ ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہوئی تھی مگر اب غالباً نایاب ہے۔

بسمل صاحب کے اجداد میں مولانا احمد علی سیماب، مولانا محمد علی اور مولانا حیدر علی کے اسمائے گرامی بھی آتے ہیں۔ علمی دنیا انھیں حدیث و قرآن کے مفسرین کی حیثیت سے جانتی ہے۔ بسمل صاحب نے اپنی شاعری میں اپنی کتابِ زندگی کی تفسیر پیش کی ہے اور یہ تفسیر ایسی زبان میں ہے کہ اس میں ہر شخص اپنی قلبی کیفیات اور ذہنی واردات کو پڑھ سکتا ہے۔

بسمل صاحب شاعری کی کلاسیکل قدروں کے علم بردار ہیں۔ اُردو شاعری بالخصوص اُردو غزل کی روایت کے ساتھ ان کا ذہنی رشتہ بھی ہے اور جذباتی تعلق بھی لیکن وہ خود روایتی شاعر نہیں ہیں۔ دراصل انھوں نے اپنی غزل میں غزل کی زندہ اور توانا روایات کو اس طرح جذب کر لیا ہے کہ یہ روایات ان کے طرزِ فکر و احساس ہی کا ایک جزو بن گئی ہیں۔ اپنے کلام میں وہ ان روایات کی کورانہ پیروی نہیں بلکہ ان کے مثبت عناصر کی توسیع کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کا شاہدِ عادل ان کا پورا کلام ہے لیکن یہاں یہ چند شعر دیکھیے جن میں روایت کا حسن اور شاعر کے تخلیقی تجربے کی تازگی، دونوں کس تناسب کے ساتھ سامنے آتے ہیں:

وہ کیوں ہونے لگا لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے　　کہ جیسے وہ بھی شامل ہوں مرے حالِ پریشاں میں

O

اِدھر اُدھر مری آنکھیں تجھے پکارتی ہیں　　مری نگاہ نہیں ہے، زبان ہے گویا

O

تمھاری جیسی شباہت کو ڈھونڈتا تھا دل　　تمھاری شکل نہ دیکھی تھی جس زمانے میں

O

توقعات نے یوں زندگی گزروادی   کہ جیسے آج تمنّا بر آئی جاتی ہے

○

نااُمیدی ہے بری چیز مگر   ایک تسکین سی ہو جاتی ہے

بسمل صاحب کی شاعری میں حزن و ملال کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں مگر غم کا تصوّر ان کے ہاں منفی نہیں مثبت ہے۔ وہ غم کو زندگی کی ایک برتر قدر کے طور پہ قبول کرتے ہیں اور مسرت کے ان عارضی مظاہر پہ اسے فوقیت دیتے ہیں جو قرار و قیام کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ غم ان کے لیے دل و دماغ کو افسردہ کر دینے والی کیفیت کا نام نہیں، خوابیدہ روحانی صلاحیتوں کو بیدار کرنے والی قوت کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غم کے شکوہ سرا نہیں، ان کیفیات کے نغمہ سرا ہیں جو غم سے عبارت ہیں:

بے خودیِ عشق جیسے غم کی نیند —— غم کی نیندیں، روح کی بیداریاں

عشرتِ دنیا مرا کیا ساتھ دیتی عمر بھر —— یہ ترا غم تھا کہ جو وابستۂ جاں ہو گیا

دل غمِ عشق کی امانت ہے —— دل میں اپنی خوشی خیانت ہے

کبھی چھیڑا تو کر مضرابِ غم سے سازِ ہستی کو   نشاطِ زندگی ہے دل اگر بیدار ہو جائے

غم کا یہ عرفان ہی کردار کی وہ استقامت پیدا کرتا ہے جو زندگی کے نشیب و فراز سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہوا کرتی ہے۔ بسمل صاحب کے وہ اشعار جن سے زندگی کی ناہمواریوں کے سامنے سپر انداز نہ ہونے اور ان سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ جھلکتا ہے، ان کے اسی ذہنی رویّے کی دین ہیں۔ اور ان کا یہ ذہنی رویّہ انھیں ان شاعروں سے الگ کرتا ہے جن کے لیے غم سامانِ گریہ و زاری کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس کے برعکس بسمل صاحب کے نزدیک لائقِ ماتم صورتِ حال وہ ہے جہاں خوشی کے سطحی مظاہر ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہو:

ہم درد انجِ دہر میں کیا یہ بڑی کمی نہیں —— ماتمِ مرگ ہے مگر ماتمِ زندگی نہیں

اپنے احساسِ مسرت کو بھی کھو دیتی ہے   جب محبت سببِ غم نہیں ہونے پاتی

ایک غمزدہ کردار کی یہ صلابت بھی دیکھیے:

غبارِ کارواں بر سرِ رہ راہوں میں مگر ہم کو   غزورِ ہمرہاں کو بے سپر کرنا بھی آتا ہے

بچاتے ہیں نگاہیں خاک کے ذرّوں سے بھی لیکن   ہمیں افلاک پہ نقد و نظر کرنا بھی آتا ہے

زمانے کے بلند و پست کے نشے میں ہیں لیکن ____ زمانے کو ہمیں زیر و زبر کرنا بھی آتا ہے
کھا رہا ہوں میں ٹھوکریں لیکن ٹھوکروں میں ہے سر زمانے کا

غم کی دل افروزیوں اور جاں بخشیوں کا احساس بسمل صاحب کی پوری شاعری میں جاری و ساری ہے۔ کہیں یہ محبت کی ودیعت کے طور پر سامنے آتا ہے تو کہیں حُسن کی نگاہِ غلط انداز کی دین کے روپ میں۔ بسمل صاحب کی شاعری کا خاص موضوع حُسن و محبت کے معاملات ہی ہیں اور احساسِ غم کی زیریں لہر نے ان میں سنجیدگی کی وہ شان پیدا کر دی ہے کہ بسمل صاحب کے کلام میں پوری حیات و کائنات اور اس کے گوناگوں مظاہر اسی رنگ میں ڈوب کر ابھرتے ہیں اور اس طرح ابھرتے ہیں کہ ان کی معنویت اور ان کی خوبصورتی کچھ اور نکھر جاتی ہے۔

بسمل صاحب کی قادر الکلامی مسلّمات کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی اس قادر الکلامی کا اظہار ان کی غزل میں بھی ہوا ہے اور ان کی نظموں اور رباعیوں میں بھی ____ ایک نظم ہے "سیاہ ساڑی" اس کی یہ چند تشبیہات دیکھیے:

خود پیکرِ صبیح ہے ساڑی سیاہ ہے پتلی میں جیسے آنکھ کی نورِ نگاہ ہے
پرتو گھٹا کا غنچۂ نورس لیے ہوئے شام اودھ ہے صبحِ بنارس لیے ہوئے
قسمت چمک اٹھی ہے لباسِ سیاہ کی روشن کسی کی ذات ہو جیسے گناہ کی

نظم "کشمکش" میں محاکات کا کمال نظر آتا ہے:

عدو کے سامنے وہ بیٹھے ہوئے ہیں میرے پاس جھکی جھکی سی نگاہیں، رکے رکے انفاس
رہین کشمکشِ عاشقی و بوالہوسی تعلقاتِ قدیم و جدید کا احساس
نہ ہے تراوشِ جذباتِ مختلف یعنی اُدھر نگاہِ محبت اِدھر نگاہِ یاس
ادا ادا کو ہے احساس ذمہ داری کا اُدھر وثوق رہے اور اِدھر نہ ٹوٹے آس

بسمل صاحب کی ایک رباعی پر جو میری نظر میں ان کی داستانِ حیات کا خلاصہ ہے، میں اس مختصر سے مضمون کو ختم کرتا ہوں:

آثارِ حیات سے بھی مر جاتا ہوں بچ جانے پہ میں جی سے گزر جاتا ہوں
اتنی کڑکی ہے غم کی بجلی دل پہ آواز سے مجھ کی ڈر جاتا ہوں

●●

کشور سین

ایک نظر ہزار امکان

وہ بے چین تھا، صندل میں کسمساتی خوشبو باہر نکلنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ چندن کو اپنا جوہر تلاش کرنے کے لیے شرارے کی ضرورت تھی۔ اگر بتی سلگائے بغیر وہ خوشبو کو خود سونگھ سکتا تھا نہ گرد و پیش میں پھیلا کر دوسروں کے دل و دماغ کو معطر کر سکتا تھا۔

- وہ اپنے آپ کو افشا کرنے کی فکر میں تھا اور کشف و عرفان کا متلاشی بھی۔

وہ چل رہا تھا۔ اندھیرے کمرے کی اندھی دیواروں پر ہاتھ پھیرتا ہوا اس دروازے کو ٹٹول رہا تھا۔ جو اُسے اُس زہر کدے میں لے جائے گا جہاں پہنچتے ہی اس کے اندر اُترنے والا امرت زندگی کے سارے زاویے اُس کی نگاہوں میں کھینچ لائے گا۔ وہ مرکرجی اُٹھے گا اور زمانے کے رُخ پر سے نقاب الٹ دے گا۔ اُس وقت کے انتظار میں وہ چلا رہا تھا ———

بند ہے در شراب خانے کا　　　حال کھلتا نہیں زمانے کا

اُسے کیا پتہ تھا کہ اُس کی معصوم خواہش کے پورا ہوتے ہی زندگی اپنی تمام تر یاسیت اور موت اپنی بے پناہ ہولناکی کے ساتھ اُس سے لپٹ جائے گی۔ شراب کا ایک ایک قطرہ اُس کے احساس کی رگوں میں نشتر بن کر اُترجائے گا۔ ہر طرح منجمد اور بے حس دکھائی دینے والی شے اپنے اندر کے انتشار کو اُس کے وجود میں منتقل کر دے گی اور اس سے سب کچھ چھین کر اُسے بے اندازہ حُزن و ملال کے حوالے کر کے پھر سے گہری نیند سو جائے گی۔ وہ لمحہ لمحہ پریشان و ہراساں ہوتا ہوا اپنی بے لبسی اور بے مائیگی کا ماتم کرتا رہ جائے گا۔

وقت کب تک گزاریئے آخر　　　یوں کہیں زندگی گزرتی ہے

اور اپنی ناآسودگی کے تئیں سرد مہری کا رویہ اپنانے کی دانستہ کوشش کرتے ہوئے اور

بھی مظلوم نظر آئے گا۔

حالِ دل اب کسی سے کیا کہیے　　جو گزرتی ہے سو گزرتی ہے

شراب خانے کا در وا ہوتے ہی اُسے گھر گھر بھٹکتے ہوئے اپنے بے گھر اور بے ٹھکانہ ہونے کا احساس ڈسنے لگے گا یہ اُس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ کب جانتا تھا کہ جس سکون کو پانے کے لیے اُس نے زہر پیا تھا وہ بے چارگی کے اژدہے کے جبڑوں میں دھکیل کر اپنے آپ میں لوٹ جائے گا۔ اس کی جستجو خام خیالی بن کر رہ جائے گی۔ وہ جدھر جائے گا بے ثباتی اس کے سُکھ اور صبر کا گلا گھونٹ دے گی۔ وہ جو بھی کرے گا اُس پر پچھتائے گا اور اپنی شکست کی آواز بن جائے گا——

جو بت کدے میں ہے ہلچل تو حشر کعبے میں　　ہم اضطراب میں کس کو پکار بیٹھے ہیں

مگر وہ میکدے کے دروازے پر دستک دینے کے لیے مجبور تھا۔ اُس کی فطرت اُسے کشاں کشاں وہاں لے گئی تھی۔ پہلے اُسے شک تھا کہ وہ یہ سب جان بوجھ کر کر رہا ہے یا یہ سب اُس کے قالب میں سمٹ آنے کی وجہ سے ہے لیکن جلدی ہی اُسے پتہ چل گیا کہ مٹی کے سانچے میں ڈھلنے سے پہلے بھی اُس کے اندر زہر پینے کی تمنا مچلا کرتی تھی۔ اب اُسی کی سیرابی اُسے بیک وقت سرشار اور بیزار کرتی ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے

کچھ اس طرح ہے مجھے دردِ عشق کا احساس　　یہ جیسے مجھ کو یوں ہی جسم و جاں سے پہلے تھا

ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ کیسے کہہ سکتا تھا——

دو دن میں ہو گیا ہے یہ عالم کہ جس طرح　　تیرے ہی اختیار میں ہوں عمر بھر سے ہم

کسی کے اختیار میں ہونے کے بعد اپنی پہلی اور اصلی حالت میں لوٹنے کا امکان نہیں رہتا۔ شراب خانے کی بھٹی اُس کے منجمد وجود کو سیّال میں تبدیل کر دیتی ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہو اپنے اندر کی تحریک کی زد میں رہتا ہے اور مضطرب ہو کر چاروں طرف دیکھتا ہوا اُن آوازوں کی سمت پہچاننے کی کوشش کرتا ہے جو ہر کہیں سے آ کر اُس کے کانوں سے ٹکراتی ہیں وہ کسی بھی سمت میں اپنا اگلا سفر شروع کر سکتا ہے۔ کوئی بھی جہت اس پر ممنوع نہیں ہے مگر اس کا تجربہ بڑا دلدوز ہے۔ قافلے کی گمشدگی اور اس کی ذات تنہا اُسے کسی بھی آواز کو معتبر نہیں ماننے دیتی۔ بت خانے سے کعبے اور کعبے سے بت خانے کا سفر کرنے کے بعد جس مایوسی اور نامرادی سے اُس کا واسطہ پڑا ہے وہ سنسناتی دہشت بن کر آوازوں کے جنگل میں پھیلتی وحشت

کا روپ دھارن کر لیتی ہے۔ وسیع و عریض صحرا میں یک و تنہا کھڑا وہ چیختا ہے ——

آتی ہے ہر طرف سے صدائے درا مجھے　　　کن مرحلوں میں چھوڑ گیا قافلہ مجھے

مگر بہاؤ رک نہیں سکتا۔ اسے ڈھلانوں سے عشق ہے، ناتمام راستے اُسے کھینچتے ہیں، بے منزل مسافتیں اُسے اشاروں سے بلاتی ہیں۔ کسی بھی سمت، کسی بھی جانب، کسی بھی طرف سہی بہتے جانا اُس کی فطرت ہے۔ اس نے لبِ آتشیں کا بوسہ لینے کا جرم کیا ہے تو سزا بھی بھگتے گا ——

تیری نگاہِ نازکی اللہ ری زدیں　　　تاکے ہیں ناوکوں نے نشانے کہاں کہاں

المیہ یہ ہے کہ سب کچھ کرنے، سہنے کے بعد بھی حاصل کچھ نہیں ہو گا۔ لاحاصلی اور تہی دستی اُس کے لبوں پر فریاد بن کر اُبھرتی ہے ——

حد بھی کوئی انتظار کی ہے　　　اب چاندنی دھوپ ہو چلی ہے

لیکن انتظار کی رُت نہیں ڈھلتی۔ وہ نامرادیوں کے ہجوم میں گھرا رہتا ہے۔ جگہ جگہ گھومتا ہوا اپنے خالی دامن کو دیکھ کر جھلّانے لگتا ہے اور آخر ایک دن زمانے سے پوچھ بیٹھتا ہے۔

ہوں گے کبھی ختم تیرے مقامات نامراد　　　ہم کو لیے پھرے گا زمانے کہاں کہاں

اس غمناک فضا میں اُس کا ساتھ اس کے کردار کی شرافت اور شائستگی دیتی ہے۔ وہ اُس کے آڑے آکر اُسے جینے کا حوصلہ مہیا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس تیرہ و تار دل میں محبت کا دیا روشن کر کے اُسے اجالے سے روشناس کراتی ہے۔ وہ پاک و صاف باطن کے ساتھ محبت کی رمز کو پہچانتا ہے اور اس میں پناہ ڈھونڈتا ہوا اُس پر تن من نچھاور کر دیتا ہے۔

چلا ہے شوقِ سجود لے کر الہٰی یہ کس کے در کی جانب
ابھی تو پہلا قدم اُٹھا ہے ابھی سے میں سر جھکا رہا ہوں

محبت کو بندگی اور الوہیت کا امتزاج مانتے ہوئے اُسے تسلّی ہوتی ہے اور وہ اِسے انسان کے دل میں پیدا ہونے والا عظیم ترین جذبہ قرار دیتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ یہی وہ قندیل ہے جو ماضی، حال اور مستقبل میں پھیلے اندھیروں کو دُور کر کے انسان کو ازلی نورانیت عطا کر سکتی ہے۔ اس کی قدر و منزلت کا اظہار کرنے کے لیے وہ الفاظ بھی ڈھونڈتا ہے ——

الوہیت بھی شامل بندگی کا لطف بھی حاصل　　　محبت کا بھی جذبہ ہائے کیا جذبہ ہے انساں میں

باطن کی تیرگی کو سوائے محبت کے چراغ کے اور کوئی چیز دور نہیں کر سکتی جس جگہ یہ شمع

روشنی نہیں ہوتی وہاں کا اندھیرا کبھی مٹ نہیں سکتا ــــــ

لاکھ چراغ ہیں مگر بزم میں روشنی نہیں ہے یہ دلوں کی تیرگی رات کی تیرگی نہیں

وہ یہ دیا سوائے دل کے مندر کے اور کہیں جل نہیں سکتا۔ اس کی ضیا ہی ہمیں دوئی کے احساس سے نجات دلاتی ہے اور ہم آہنگی کی مسرّت سے نوازتی ہے۔ بغض، عناد اور نفاق کی کثافت کو دور کر کے پیار، دوستی اور میل ملاپ کی لطافت کا سحر بکھیرتی ہوئی انسان کو انسان سے بغل گیر کراتی ہے ــــــ

جس میں ناقوس ہم آواز اذاں ہوتا ہے صرف دل ہی تو وہ معبد ہے وہ اک معبدِ عشق

لیکن یہ تو ایک آواز تھی، ایک سمت تھی، سفر کا ایک پڑاؤ تھا۔ یہ اختتامِ سفر نہیں تھا نہ انکشافِ حیات کا آخری مرحلہ۔ شراب خانے کی دین یہیں ختم نہیں ہوتی۔ عشق و جنوں بھی عارضی ثابت ہوتے ہیں۔ زمانہ تغیّر پذیر ہے۔ زندگی کروٹ پر کروٹ بدلتی ہے معصوم شاعر کی توقعات لامحدود ہوتی جاتی ہیں حالانکہ وہ زمانے کی رفتار دیکھ کر حیران و ششدر کھڑا رہ جاتا ہے ــــــ

بیٹھا نہیں ہوں سایۂ دیوار دیکھ کر ٹھہرا ہوا ہوں وقت کی رفتار دیکھ کر

یہیں کھڑے کھڑے وہ روح فرسا گھڑی آپہنچتی ہے جب اس کا پورا وجود تشنگی کے احساس کی شدّت سے بے حال ہو کر اپنا ماتم آپ کرنے لگتا ہے۔

توقعات نے یوں زندگی گزروادی۔
کہ جیسے آج تمنّا بر آئی جاتی ہے

یہی جانکاہ صدمہ اسے مرگِ مسلسل کے تصوّر سے ہم آہنگ کر کے اپنے انجام کی کربناکی سے واقف و متعارف کراتا ہوا ہر شے کو بے اعتباری کی نظر سے دیکھنے کے لیے آمادہ کرنے کے بعد اس کو ناامیدی کے غار میں اتار دیتا ہے۔ یہ اس کے عرفان کی زنجیر کی آخری کڑی ہے۔ شراب خانے سے اس کا لگاؤ اسے عدمیت کی ہولناکیوں کے سپرد کرنے پر تل جاتا ہے۔ وہ سہمے ہوئے ہرن کی طرح چاروں سمت بھاگنے کی کوشش کرتا ہے لیکن سمتیں اور راستے معدوم ہونے لگتے ہیں۔ موت کے احاطے کو اپنے گرد تنگ ہوتے اور چو رستے کو نقطے میں تبدیل ہوتے دیکھتا ہے تو اسے مایوسی کے عالم میں نیستی کے دبیز تر ہوتے اندھیروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ــــــ

موت سے بچ کر کدھر جاؤں میں بسمل کیا کروں
ہر طرف سے کوئے قاتل میں پہنچ جاتا ہوں میں

◄ متاعِ فن ►

مری شاعری خلطِ مبحث نہیں ہے
محبّت کی روداد ہے اور میں ہوں

انتخاب

مخمور سعیدی
عنوان چشتی
پریم گوپال متّل

انتخابِ غزلیات

غمِ عشقِ محمدؐ میں کوئی دیکھے فنا ہو کر
اجل ہنستی ہوئی آتی ہے پیغامِ بقا ہو کر

گرے ہیں جو غمِ اُمت میں مژگانِ محمدؐ سے
وہ آنسو حشر میں برسیں گے رحمت کی گھٹا ہو کر

مدینے کی زمیں پر لذتِ سجدہ کوئی دیکھے
کہ فرض اک سجدہ کر دیتا ہے ہر سجدہ ادا ہو کر

ضرورت دیکھ کر یکسوئی کی ذہنِ مقدس کو
اُتر آیا زمیں پر لامکاں غارِ حرا ہو کر

حصولِ تازگی کے واسطے ہر صبح کو بسملؔ
ہوائے خُلد آتی ہے مدینے میں صبا ہو کر

○

غبارِ کارواں بر سر ہیں راہوں میں مگر ہم کو
غرورِ ہمرہاں کو پے سپر کرنا بھی آتا ہے

بچاتے ہیں نگاہیں خاک کے ذروں سے بھی لیکن
ہمیں افلاک پر نقد و نظر کرنا بھی آتا ہے

ہم اک عمرِ خضر ہر آن ضائع کر چکے لیکن
ہمیں ہر آن کو عمرِ خضر کرنا بھی آتا ہے

جو دن کٹتے نہیں تقدیر کے زیرِ اثر ہم سے
اُنھیں تدبیر کے زیرِ اثر کرنا بھی آتا ہے

غرورِ چارہ گر جب درد کی حد سے گزر جائے
ہمیں اطلاقِ درماں درد پر کرنا بھی آتا ہے

ابھی جنسِ ہنر ہے منفعل جس نقدِ دولت سے
اُسے شرمندۂ جنسِ ہنر کرنا بھی آتا ہے

زمانے کے بلند و پست کے نرغے میں ہیں لیکن
زمانے کو ہمیں زیر و زبر کرنا بھی آتا ہے

نظر کو ٹھوکروں میں رکھنے والو جلوہ گاہوں میں
ہمیں جلووں کو پامالِ نظر کرنا بھی آتا ہے

مِلا کر اپنی قسمت کے ستارے خاک میں بسملؔ
ہمیں ذروں کو خورشید و قمر کرنا بھی آتا ہے

○

گزر کے عشق کی حد سے بھی کچھ یہ عالم ہے
کہ جیسے عشق ابھی اُن کے حُسن تک ہے

وہی ہوتی ہے رہبر جو تمنا دل میں ہوتی ہے
بقدرِ ہمتِ رہرو کشش منزل میں ہوتی ہے

محبت اے معاذ اللہ محبت، دم نکل جائے
اگر محسوس بھی اتنی ہو جتنی دل میں ہوتی ہے

ٹھہرنے بھی نہیں دیتی ہے اس محفل میں بیتابی
مگر تسکین بھی جا کر اُسی محفل میں ہوتی ہے

پرستش کر، محبت کرنے والوں کی پرستش کر
خدا ہوتا ہے دل میں جب محبت دل میں ہوتی ہے

مرا کیا ساتھ دیں گے غیر بحرِ عشق میں بسمل
وہ اُس کشتی میں ہیں جو دامنِ ساحل میں ہوتی ہے

○

اثر اندوزِ دو عالم نہیں ہونے پاتی
تیری محفل کبھی برہم نہیں ہونے پاتی

وسعتیں عشق کی محدود ہوئی جاتی ہیں
آرزو ہے کہ ابھی کم نہیں ہونے پاتی

اپنے احساسِ مسرت کو بھی کھو دیتی ہے
جب محبت سببِ غم نہیں ہونے پاتی

مل گیا رنگ بھی تخلیق میں تیری ورنہ
صرف نکہت تو مجسم نہیں ہونے پاتی

اللہ اللہ رے محبت کا وہ عالم کہ یہ جب
کوئی ٹھہرا ہوا عالم نہیں ہونے پاتی

تم سے آنسو بھی مرے اب نہیں پونچھے جاتے
جذبِ خورشید سے شبنم نہیں ہونے پاتی

صدمۂ ہجر سے کم بخت نہ گزرے جب تک
آرزو وصل کی محکم نہیں ہونے پاتی

ہائے بے ربطیِ انعکاسِ محبت بسمل
آہ کم بخت بھی ہمدم نہیں ہونے پاتی

○

کب سے اُلجھ رہے ہیں دمِ واپسیں سے ہم
دو اشک پونچھنے کو تری آستیں سے ہم

ہوگا تمہارا نام ہی عنوانِ ہر ورق
اوراقِ زندگی کو اُلٹ دیں کہیں سے ہم

سنگِ درِ عدو پہ ہماری جبیں نہیں
یہ سجدے کر رہے ہیں تمہاری جبیں سے ہم

دُہرائی جا سکے گی نہ اب داستانِ عشق
کچھ وہ کہیں سے بھول گئے ہیں کہیں سے ہم

○

کیا زیست تباہ ہو گئی ہے
ہر سانس اک آہ ہو گئی ہے

تاریک ترے بغیر دنیا
تا حدِّ نگاہ ہو گئی ہے

اب ہجر کی رات چاندنی سے
کچھ اور سیاہ ہو گئی ہے

اُٹھتی ہی نہیں کسی طرف اب
مایوس نگاہ ہو گئی ہے

کیا چیز ہے بندگی کہ اکثر
طاعت بھی گناہ ہو گئی ہے

اے وقت نہ پوچھ تیرے ہاتھوں
کیا چیز تباہ ہو گئی ہے

جاتی تھی کبھی جو دل سے دل تک — مسدود وہ راہ ہو گئی ہے
پڑتے ہی جبین وقت پر بل — کج اپنی کلاہ ہو گئی ہے
بربادیِ دل کے ساتھ بسمل — دنیا ہی تباہ ہو گئی ہے

○

جب وہ در پردۂ اسرار نظر آتے ہیں — کس قدر مختلف انوار نظر آتے ہیں
واے بیدادِ جنوں دشت میں دیوانے کو — ہر طرف کچھ در و دیوار نظر آتے ہیں
مجھ سے بد بختیِ ادراکِ غمِ عشق نہ پوچھ — صبح سے شام کے آثار نظر آتے ہیں
عرصۂ حشر میں مجبورِ مشیت بسمل — کتنے معصوم گنہگار نظر آتے ہیں

○

فراہم جس قدر عشرت کے ساماں ہوتے جاتے ہیں — سکونِ روح سے محروم انساں ہوتے جاتے ہیں
کبھی طرزِ تغافل تھے ۔ یہی اندازِ محبوبی — جواب صرفِ نوازش ہائے پنہاں ہوتے جاتے ہیں
شباب و حسنِ روز افزوں کا ان کے کچھ یہ عالم ہے — کہ ہم شرمندۂ شوقِ فراواں ہوتے جاتے ہیں
ابھی جامِ مئے رنگیں لبِ لعلیں تک آیا ہے — مگر آنکھوں میں میخانے سے غلطاں ہوتے جاتے ہیں
فضائے خلد پر جیسے گھٹائیں چھائے جاتی ہوں — رُخِ گل رنگ پر گیسو پریشاں ہوتے جاتے ہیں
نفس کی آمد و شد کا یہ عالم ہے جدائی میں — کہ نشتر جیسے پیوستِ رگِ جاں ہوتے جاتے ہیں
تعالی اللہ فیضِ باغباں بسمل تعالی اللہ — خس و خاشاکِ گلشن گل بداماں ہوتے جاتے ہیں

○

پر توِ حسن ایک ہے اور آئینہ خانے بہت — اک حقیقت نے بنا ڈالے ہیں افسانے بہت
کھو نہ جائیں کثرتِ اصنام میں وحدت پرست — بندگی کے ذہن میں ہوتے ہیں بتخانے بہت
بسمل اس دلی کے ان سنسان ویرانوں میں آہ — گونجتے ہیں آج بھی عبرت کے افسانے بہت

○

حد بھی کوئی انتظار کی ہے — اب چاندنی دھوپ ہو چلی ہے
کیفیتِ عشق اب تو شاید — کچھ عشق کی حد سے بڑھ گئی ہے
ہے میری محبت ان کو معلوم — محسوس ابھی نہیں ہوئی ہے
دل اس سے سوا ہے آرزومند — جتنا اسے آنکھ دیکھتی ہے

غنچہ دہنی تو کوئی دیکھے
آواز میں اک شگفتگی ہے
معصومیِ حسن پر بھی کم بخت
یک عشق و ہزار بدظنی ہے
جذبات نہ ہوں تو شاعری کیا
جذبات کا نام شاعری ہے

○

رہروِ راہِ محبت کون سی منزل میں ہے
دل ہے بیزارِ محبت اور محبت دل میں ہے
کیا زباں پر ہے کسی کی، کیا کسی کے دل میں ہے
جس کی محفل ہے وہی جانے وہ جس مشکل میں ہے
کاروانِ حسن و عشق اب تک کہیں ٹھہرا نہیں
قیس ابھی صحرا میں ہے، لیلیٰ ابھی محمل میں ہے
ہو چکے مقتل تو سب دارالاماں میں منتقل
پھر یہ اب کس کا جنازہ کوچۂ قاتل میں ہے
عشرتِ رفتہ کا رونا کیا، غمِ امروز میں
عیشِ فردا بھی وہ ماضی ہے جو مستقبل میں ہے
اس کی کثرت پر فدا میں، اس کی وحدت پر نثار
جس کسی کے دل میں ہے گویا اسی کے دل میں ہے
چاہتے ہیں تم سے بھی سن لیں جوابِ عرضِ شوق
ورنہ ہم خود جانتے ہیں جو تمہارے دل میں ہے
رنگِ محفل میں نظر آتا ہے اک رنگِ دگر
تیری محفل کے سوا بھی کچھ تری محفل میں ہے
ہمسفر کچھ دن رہے، لیکن خدا جانے کہ اب
عشق ہے کس مرحلے میں، حسن کس منزل میں ہے
منزلِ مقصود بسمل وہ نظر آنے لگی
ہر نظر منزل پہ جیسے ہر قدم منزل میں ہے

○

اس زندگی کو عشرتِ امروز چاہیے
مجھ سے تو روز وعدۂ فردا کرے کوئی
رہ رہ کے اب وہ آپ جھجکتے ہیں اس طرح
جیسے کسی کو دیکھ کے پردہ کرے کوئی

○

سر جس پہ نہ جھک جائیں اسے در نہیں کہتے
ہر در پہ جو جھک جائے اسے سر نہیں کہتے
کعبے میں مسلمان کو کہہ دیتے ہیں کافر
بت خانے میں کافر کو بھی کافر نہیں کہتے
رندوں کو ڈرا سکتے ہیں کیا حضرتِ واعظ
جو کہتے ہیں اللہ سے ڈر کر نہیں کہتے
ہر بار نئے شوق سے ہے عرضِ تمنا
سو بار بھی ہم کہہ کے مکرر نہیں کہتے
میخانے کے اندر بھی وہ کہتے نہیں میخوار
جو بات کہ میخانے کے باہر نہیں کہتے
کہتے ہیں محبت فقط اس حال کو بسمل
جس حال کو ہم ان سے بھی اکثر نہیں کہتے

○

شعاعِ مہر میں رنگینیاں جیسے بہاروں کی
کسی کے حسن کا عالم ہے یا صبحِ گلستاں ہے

نسیمِ صبح سے منہ پھیر کر یہ مسکراتے ہیں
گلوں میں کس کا اندازِ تبسم ہائے پنہاں ہے

قبولِ اعتبارِ حسن اگر ہو جائے تو بسمل
محبت ایک وعدہ ہے تمنا ایک پیماں ہے

○

جو دکھائے اُن کا حسن کارفرما دیکھیے
صبحِ حسرت دیکھیے شامِ تمنا دیکھیے

دیکھ کر گلگشت اک مستِ خرامِ ناز کی
ساغرِ گل رنگ میں کیا موجِ صہبا دیکھیے

قدِ آدم ہو کے جیسے رہ گیا ہو آفتاب
اک سراپا حسن کا حسنِ سراپا دیکھیے

حسرتِ جلوہ بقدرِ حاصلِ نظارہ ہے
اتنی ہی بڑھتی ہے حسرت اُن کو جتنا دیکھیے

دست و دامن میں نہ ہو جیسے کوئی وابستگی
میرے دستِ شوق سے دامن چھڑاتا دیکھیے

فرض ہی پابندیِ آئینِ میخانہ سہی
بسملِ اوّل چشمِ ساقی کا اشارہ دیکھیے

○

وہ بے نیاز تو مستغنیِ کرم ہیں ہم
وہ اور ہوں گے جو اُمیدوار بیٹھے ہیں

نہ التفات کی خواہش نہ بے رُخی کا ملال
ہم ان کی بزم میں بیگانہ وار بیٹھے ہیں

نظامِ دہر مرتب یہیں تو ہوتا ہے
یہ میکدہ ہے جہاں بادہ خوار بیٹھے ہیں

جو بت کدے میں ہے ہلچل تو حشر کعبے میں
ہم اضطراب میں کس کو پکار بیٹھے ہیں

وہ آکے دیکھ لیں بسمل مری وطن گردی
جو خوش نصیب غریب الدیار بیٹھے ہیں

○

رُلائے جاتے ہیں اور مسکرائے جاتے ہیں
وہ میرے غم پہ خوشی بن کے چھائے جاتے ہیں

شگفتہ ہیں مرے گلہائے آرزو تم سے
یہ پھول خود نہیں کھلتے کھلائے جاتے ہیں

خدا ہی جانے کہاں شام ہونے والی ہے
سحر سے آج قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

تری نظر ہے کہ اندازۂ مشیّت ہے
تری نظر سے مقدر بنائے جاتے ہیں

خدا کے بندے کبھی کعبے میں اب نہیں بنتے
صنم کدے میں خدا بھی بنائے جاتے ہیں

○

ہیں کشتگانِ دل کے ٹھکانے کہاں کہاں
بکھرے پڑے ہیں غم کے فسانے کہاں کہاں

تیرِ نگاہِ ناز کی اللہ ری زدیں
تاکے ہیں ناوکوں نے نشانے کہاں کہاں

خوابیدہ دشت و در کی ہے بیدار خامشی
گونجے ہوئے ہیں تیرے ترانے کہاں کہاں

اب بھی گیا ہو اُن کو پتہ تیرا کیا خبر
پہنچے ہیں اپنی دھن میں دوانے کہاں کہاں

اس آسماں نے چھین کے ہم سے زمین میں
جانے چھپا دیے ہیں خزانے کہاں کہاں

واں تک بھی ختم تیرے مقامات نامراد
ہم کو لیے پھرے گا زمانے کہاں کہاں

ممکن ہزاروں زندۂ جاوید جستجو
پہنچے ہیں اس اجل کے بہانے کہاں کہاں

○

بہار سے عشق چاہے زندگی آزار ہو جائے
مسلسل قہقہہ اک آنسوؤں کا تار ہو جائے

کم از کم اس قدر تو آدمی ہشیار ہو جائے
کہ جب دنیا نہ آئے راس تو بیدار ہو جائے

کبھی چھیڑا تو کر مضراب غم سے ساز ہستی کو
نشاطِ زندگی ہے دل اگر بیدار ہو جائے

بہاریں زندگی کی یوں مری قسمت میں لکھی ہیں
کہ میں جس پھول کو دامن میں رکھوں خار ہو جائے

کبھی اسے آفتاب ایسی بھی کوئی صبح پیدا کر
صدا ناقوس کی سن کر حرم بیدار ہو جائے

○

وہ آرزو، وہ تمنا، وہ اضطراب نہیں
میں اب وہاں ہوں جہاں کوئی باریاب نہیں

تری نگاہ کی شوق آفرینیاں توبہ
جو کامیاب ہے وہ بھی تو کامیاب نہیں

مجھے پکار رہے ہیں صنم کدے والے
مری دعائیں جو کعبے میں مستجاب نہیں

جب التفات نہ تھا اشتیاق رہتا تھا
اب التفات ہوا ہے تو دل کو تاب نہیں

وہیں سے اُٹھتے ہیں ہر انقلاب کے بادل
وہ میکدہ کہ جہاں کوئی انقلاب نہیں

بدل گئے ہیں شب و روزِ زندگی بسمل
وہ ماہتاب نہیں اب وہ آفتاب نہیں

○

وہ کیوں ہونے لگے لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے وہ بھی شامل ہوں مرے حالِ پریشاں میں

اُلوہیت بھی شامل بندگی کا لطف بھی حاصل
محبت کا بھی جذبہ ہائے کیا جذبہ ہے انساں میں

○

کون سمجھے عشق کی دشواریاں
اک جنوں اور لاکھ ذمہ داریاں

اہتمامِ زندگی عشق دیکھ
روز مر جانے کی ہیں تیاریاں

عشق کا غم وہ بھی تیرے عشق کا
کون کر سکتا مری غمخواریاں

بے خودیِ عشق، جیسے غم کی نیند — غم کی نیندیں، روح کی بیداریاں
عشق بھی ہے کس قدر برخود غلط — اُن کی بزمِ ناز اور خودداریاں
اس محبت اُس جوانی کی قسم — پھر نہ یہ نیندیں نہ یہ بیداریاں
یہ نیازِ آرزومندی نہ دیکھ — اور کچھ ہیں عشق کی خودداریاں

○

نفس نہیں کوئی ایسا کہ جاں گداز نہیں — یہ میرا عشق ہے زاہد تری نماز نہیں
ہوس کی زندگیِ جاوداں پہ لعنت ہے — بلا سے عمرِ محبت اگر دراز نہیں
اگر کسی کی محبت میں کوئی راز نہ ہو — تو پھر کسی کی محبت تو کوئی راز نہیں
نگہ بھی جرم کبھی جرم بے نگاہی بھی — کسی اصول پہ وہ جلوہ گاہِ ناز نہیں
میں بے نیاز سہی تم سے بھی محبت میں — مگر تمھاری محبت سے بے نیاز نہیں
سنائی دیتی ہے محسوسِ جان و دل ہو کر — وہ اِک صدا جو ہنوز آشنائے ساز نہیں

○

اپنے دامن سے مرے پونچھنے والے آنسو — دامنِ خاک سے اب آ کے اُٹھالے آنسو
باغ میں آج تری یاد میں رونے کے لیے — میں نے پھولوں کے تبسم سے نکالے آنسو
میری آنکھوں سے تم اب اپنی امانت لے لو — بدنصیبوں کے کوئی پونچھ نہ ڈالے آنسو
پھر خدا جانے رہے ان میں روانی نہ رہے — چشمِ خوں بار ابھی اور بہالے آنسو
اب یہ کم بخت کریں کس کے حوالے بسمل — کر دیے دل نے تو آنکھوں کے حوالے آنسو

○

محبت تم سے بے اندیشۂ جاں کر رہا ہوں میں — تمھاری ہی محبت کو نگہباں کر رہا ہوں میں
محبت ہی مرے ہر کام کو مشکل بناتی ہے — محبت ہی سے ہر مشکل کو آساں کر رہا ہوں میں
نہ ہونا لائقِ زندانِ ہستی، امرِ دیگر ہے — مگر پابندیِ آئینِ زنداں کر رہا ہوں میں
دل اُن کا، جان ان کی، عشق ان کا آرزو اُن کی — مگر بایں ہمہ کچھ ان پہ قرباں کر رہا ہوں میں
جب آنکھیں اٹھ گئیں دیکھا کہ ہے کچھ اور ہی عالم — عجب نظارۂ حسنِ فراواں کر رہا ہوں میں
محبت سے کہیں اُس کا تحمل ہی نہ ہو بسمل — محبت کے بھروسے پر جو ارماں کر رہا ہوں میں

○

نہ جانے خود روی عشق کس جگہ لے آئی | کہ گمرہی مری محتاجِ رہبری نہ رہی
نیازِ عشق پہ تھی منحصر نوازشِ حسن | وہ بندگی نہ رہی، بندہ پروری نہ رہی

○

ہوس کی دنیا میں رہنے والوں کو میں محبت سکھا رہا ہوں
جہاں پہ دامن بچھے ہوئے ہیں وہاں پہ آنکھیں بچھا رہا ہوں
الٰہی دنیا میں اور کچھ دن ابھی قیامت نہ آنے پائے
ترے بنائے ہوئے بشر کو ابھی میں انساں بنا رہا ہوں
عدم کے تاریک راستے میں کوئی مسافر نہ راہ بھولے
میں شمعِ ہستی بجھا کر اپنی چراغِ تربت جلا رہا ہوں
ملی ہے کانٹوں کی مجھ کو قسمت مگر ہے پھولوں کی میری فطرت
جہاں ہوں پامالِ غم ہوں لیکن جہاں بھی ہوں مسکرا رہا ہوں
چلا ہے شوقِ سجود لے کر الٰہی یہ کس کے در کی جانب
ابھی تو پہلا قدم اٹھا ہے ابھی سے میں سر جھکا رہا ہوں

○

ہر بلند و پست کو اس طرح ٹھکراتا ہوں میں | کوئی یہ سمجھے کہ جیسے ٹھوکریں کھاتا ہوں میں
کون جانے یا میں جانوں یا مری تنہائیاں | جانے کیا کہہ کر دلِ مضطر کو سمجھاتا ہوں میں
ہائے وہ محویتِ ذوقِ تصورِ ہجر میں | جب نفس کی آمد و شد سے بھی گھبراتا ہوں میں
فکرِ انجامِ محبت، عالمِ تنہائی میں | جیسے اپنے آپ میں ڈوبا چلا جاتا ہوں میں
جب وہ ہوتے ہیں تو ہر شے جیسے ہو جاتی ہے گم | وہ نہیں ہوتے تو ہر شے میں انھیں پاتا ہوں میں
موت سے بچ کر کدھر جاؤں میں تسلیم کیا کروں | ہر طرف سے کوئے قاتل میں پہنچ جاتا ہوں میں

○

خدا نے جنتیں بھر دیں محبت کی عبادت میں | تمھارا آستاں لکھ کر مرے سجدوں کی قسمت میں
کسی تصویر میں رنگِ مذاقِ ہر نظر جیسے | یہی عالم قبولِ حسن کا ہے اُن کی صورت میں
نظر جب حسن آتا ہے کسی منظر میں دنیا کے | اضافہ ہو کے رہ جاتا ہے وہ تیری محبت میں
مشیت تک رہی ہے منہ اچنبھے سے شریعت کا | مری فردِ عمل رکھی ہے میزانِ قیامت میں

وہ قدِ آدم آئینے میں بسمل اُن کی انگڑائی
جوانی جس طرح بیدار ہوتی ہے طبیعت میں

○

فریبِ حُسن ہے دُنیا مری نظر کے لیے
نگاہِ عشق نہیں حسن رہ گزر کے لیے

کسی جبیں میں کسی در کے واسطے بھی نہیں
مری جبیں میں جو سجدے ہیں تیرے در کے لیے

تمام عمر بھی گزرے جو بن کے ظلمتِ شب
کریں نہ منتِ خورشید ہم سحر کے لیے

قبولیت کو اگر ہیں عبادتیں درکار
گناہ چاہئیں رحمت کو درگزر کے لیے

بلائے عشق سے بسمل نہ رکھ اُمیدِ نجات
دعائے صبح نہ کر شامِ بے سحر کے لیے

○

ذوقِ نظر ہے یا کوئی جلوۂ بے ظہور ہے
محوِ طلسمِ شوق ہوں، غیب ہے یا حضور ہے

عقدۂ مرگِ عاشقی کھولتا جا رہا ہے وہ
مسئلۂ حیات پر جتنا جسے عبور ہے

بسمل اگرچہ اب نہیں فرصتِ کاروبارِ عشق
پائے طلب نہیں مگر ذوقِ طلب ضرور ہے

○

آتی ہے ہر طرف سے صدائے درا مجھے
کن مرحلوں میں چھوڑ گیا قافلہ مجھے

یارب جنونِ عشق میں وہ لمحہ اب نہ آئے
محسوس جس میں ہو کہ یہ کیا ہو گیا مجھے

اشکوں میں رنگِ حسن ہے آہوں میں بوئے حسن
راس آ گئی ہے عشق کی آب و ہوا مجھے

○

یہ افسانہ ابھی تو زیرِ عنوانِ کرم بھی ہے
سُنائے جاؤں میں اُن کے ستم کی داستاں کب تک

قفس میں تو مجھے جب تک بھی رہنا ہو مگر یارب
تصوّر میں مرے جلتا رہے گا آشیاں کب تک

غضب ہے ٹھیس لگنا عشق کی خود داریِ فطرت کو
بس اے چشمِ کرم اب التفاتِ رائگاں کب تک

دلِ مایوس میں کچھ خارِ حسرت سے کھٹکتے ہیں
خدا جانے رہیں گی راکھ میں چنگاریاں کب تک

نہیں جب پاسِ وعدہ تو مکر بھی جاؤ گے اک دن
بدل جائے گا جب دل تو نہ بدلے گی زباں کب تک

کبھی امید کی نظروں سے دیکھ اپنی طرف بسمل
نگاہِ یاس سے دیکھے گا سوئے آسماں کب تک

○

اگرچہ سجدے ہیں ممنونِ آستاں لیکن
مذاقِ سجدہ مجھے آستاں سے پہلے تھا

تمھیں کہو، کبھی تم نے سُنا تھا خوش ہو کر
تمھارا ذکر جو میرے بیاں سے پہلے تھا

نہ شوقِ رہبری دل نہ ذوقِ غارتِ جاں
عجب طریق مرے کارواں سے پہلے تھا
کچھ اس طرح ہے مجھے دردِ عشق کا احساس
یہ جیسے مجھ کو یہ نہیں جسم و جاں سے پہلے تھا
ہنوز دل میں اُسی شدّ و مدّ سے ہے بسملؔ
وہ حوصلہ جو مجھے امتحاں سے پہلے تھا

○

عشق رکھتا ہے جس جگہ دل کو
میں بھی اکثر وہاں نہیں ہوتا
عشق ہوتا ہے دل کا اک عالم
دل کا عالم بیاں نہیں ہوتا

○

بند ہے در شراب خانے کا
حال کھلتا نہیں زمانے کا
بزمِ صیاد میں اجالا ہے
جانے کس کے سیاہ خانے کا
کھا رہا ہوں میں ٹھوکریں لیکن
ٹھوکروں میں ہے سر زمانے کا
کون ہے جو نہیں زمانے میں
کس سے شکوہ کریں زمانے کا
تم نہ ہوتے اگر زمانے میں
کس سے اُٹھتا ستم زمانے کا
شاید اس دور میں نہیں بسملؔ
کارفرما کوئی زمانے کا

○

عشقِ گستاخ کی شہ پر ترا خواہاں ہو کر
دل دھڑکتا ہے لرزتا ہوا ارماں ہو کر
گل تو گل خار پہ دیکھی جو کبھی گرمِ شعاع
چھا گئے باغ پہ ہم ابرِ بہاراں ہو کر
کتنے خورشیدِ حیات اِس افقِ ہستی پر
رہ گئے شمعِ سرِ گورِ غریباں ہو کر
اب ترے عشق کی ہو گی نہ حفاظت مجھ سے
اب ترا عشق رہے میرا نگہباں ہو کر
ہو گئے درج فرشتوں کی غلط فہمی سے
تیری رحمت کے تقاضے مرے عصیاں ہو کر
زندگی کفر کی بھی تم سے نہ گزری بسملؔ
کچھ بھی غیرت ہے تو مر جاؤ مسلماں ہو کر

○

ہے کیوں ہنوز حوصلۂ امتحاں مجھے
تم مطمئن نہیں ہوا ابھی امتحاں سے کیا
کھوئیں گے دو جہاں کو ہمیں تیرے عشق میں
کھوئے گا تیرا عشق ہمیں دو جہاں سے کیا
ہاں تو نے آستاں سے مجھے تو اٹھا دیا
سجدے بھی اُٹھ سکیں گے ترے آستاں سے کیا
اُلجھے سے جا رہے ہیں کچھ انفاسِ زندگی
ٹوٹے گا سلسلہ یہ کبھی [illegible] سے کیا

واقف نہ تھا میں ترکِ تعلق سے ہم نشیں!
ہوتی ہے ابتدائے محبت یہاں سے کیا

○

سپردِ زیست میں پاکر سکونِ زندگی میں نے
انھیں کو دے دیا ہے اختیارِ موت بھی میں نے

کہاں میں اور کہاں تیری محبت اس طرح لیکن
دبا ہے اپنی ہستی کو فریبِ زندگی میں نے

بایں عجز و نیازِ بندگی بھی کچھ یہ عالم ہے
کہ جیسے آستانِ نازکی توہین کی میں نے

کچھ ایسے لوگ محرومِ خوشی دیکھے ہیں دنیا میں
کہ اپنے حق میں غم کر لی ہے اپنی ہر خوشی میں نے

زمانہ ہنس رہا ہے آج بسملؔ میرے رونے پر
نہ جانے کس کے رونے کی اڑائی تھی ہنسی میں نے

○

بس اب زندگی ماتمِ زندگی ہے
غمِ عمرِ برباد ہے اور میں ہوں

تصور ہے، افسردہ تنہائیاں ہیں
تری بزم کی یاد ہے اور میں ہوں

مری شاعری خلطِ مبحث نہیں ہے
محبت کی رُوداد ہے اور میں ہوں

○

آپ جانا بھی نہیں اُن کو بلانا بھی نہیں
مگر اس طرح کچھ آسان بھلانا بھی نہیں

جو فسانوں کو حقیقت میں بدل دیتے تھے
آج دنیا میں کہیں اُن کا فسانہ بھی نہیں

کیوں نہ بیتی ہوئی باتوں کو بھلا ہی بیٹھیں
اب وہ ہم تم بھی نہیں اب وہ زمانہ بھی نہیں

تم جب آتے ہو تو جانے کے لیے آتے ہو
اب جو آکر تمھیں جانا ہو تو آنا بھی نہیں

کنجِ تربت کا تصور ہے غنیمت بسملؔ
ورنہ دلّی میں کوئی اور ٹھکانا بھی نہیں

○

سنگ اُس آئینے کو کہتے ہیں
جس میں آئینہ گر نہیں ہوتا

عشق نومید تو نہیں لیکن
عشق اُمید پر نہیں ہوتا

○

کیا ترکِ آرزو بھی نہیں، ہے قبولِ حسن
اُٹھتے ہیں پانو اُدھر اب ارادہ کیے بغیر

اے جذبِ عشق دیکھ یہ ہوتا ہے نازِ حسن
یوں آئے ہیں وہ جیسے ارادہ کیے بغیر

اللہ رے شرطِ عشق کہ ناکامیوں پہ بھی
بسملؔ رہا نہ جائے تمنا کیے بغیر

○

محبت میں کہیں یوں بھی کوئی برباد ہوتا ہے
کہ جو عالم گزر جاتا ہے مجھ کو یاد ہوتا ہے

نہیں ہے شاد کامِ آرزو ہونا اگر ان سے
تو پھر اُن کے تصور سے بھی دل کیوں شاد ہوتا ہے

خدا! احساسِ رشکِ غیر کی منزل گزروا دے
یہاں رہ کر مرا ذوقِ وفا برباد ہوتا ہے

درو دیوارِ زندانِ محبت پر یہ لکھا ہے
یہاں جو قید ہوتا ہے وہ بے میعاد ہوتا ہے

یہ اُن کی بے نیازی ہے کہ وہ سجدوں کو ٹھکرا دیں
کہیں اپنا مذاقِ بندگی برباد ہوتا ہے

جنونِ عشق بسملؔ ان خیالوں ہی کو کہتے ہیں
کہ جن سے شاد فرقت میں دلِ ناشاد ہوتا ہے

○

رہنے کو ہم قفس میں رہے آشیاں سے دُور
لیکن چمن میں تھی یہ جگہ آسماں سے دُور

تجھ سے بھی دُور تک کوئی ایسی جگہ نہیں
محفل میں اپنی تو نظر آئے جہاں سے دُور

اُس نامراد سے جو ترے آستاں پہ ہے
اچھا ہے بدنصیب جو ہے آستاں سے دُور

اب تک کوئی بتا نہ سکا راہِ عشق میں
منزل کہاں سے پاس ہے بسملؔ کہاں سے دُور

○

میں بھی مشکل سے اُٹھا رشک بھی مشکل سے اٹھا
دل وہیں بیٹھ گیا جب تری محفل سے اُٹھا

آپ میں آنے کی پھر کوئی جہت ہی نہ رہی
میں تری بزم سے جب تیرے مقابل سے اُٹھا

عینِ دریا کا تلاطم تو رہا ساحل تک
ہو گیا غرق وہ طوفان جو ساحل سے اُٹھا

ڈگمگاتا تھا اِدھر پائے طلب کا بسملؔ
شورِ لبیک اُدھر جانبِ منزل سے اُٹھا

○

اُن کے فریبِ لطف کے دن بھی گزر گئے
اب مطمئن ہیں اپنے غمِ معتبر سے ہم

کتنا بلند عشق کی غیرت نے کر دیا
جس دن سے گر گئے ہیں تمہاری نظر سے ہم

بیٹھیں تو کس امید پہ بیٹھے رہیں یہاں
اُٹھیں تو اُٹھ کے جائیں کہاں تیرے در سے ہم

دو دن میں ہو گیا ہے یہ عالم کہ جس طرح
تیرے ہی اختیار میں ہوں عمر بھر سے ہم

خود جس قدر بلند ہیں اپنی نگاہ میں
اتنے نہ گر سکیں گے تمہاری نظر سے ہم

دیکھیں گے کیا کسی کو اب اپنی نگاہ سے
خود کو بھی دیکھتے ہیں تمہاری نظر سے ہم

○

ہوتی ہے محسوس اک مشکل پسِ مشکل مجھے
یہ نظر آتا ہے شاید اپنا مستقبل مجھے

حال ہے یا ماورائے حال کچھ کھلتا نہیں
آج تک جاری ہے تکمیلِ کرم کا سلسلہ

جانے کس عالم میں رکھتی ہے تری محفل مجھے
غم دیا جاتا ہے بسملؔ بر بنائے دل مجھے

○

جس آرزو میں تیری خوشی بھی نہ ہو شریک
اب یوں گزر رہی ہے محبت میں زندگی
بسملؔ غرور بن کے نہ شاعر میں گر سمائے

وہ آرزو نصیبِ دلِ دشمناں رہے
جیسے اندھیری رات میں دریا رواں رہے
تو بحرِ پائمالِ تکبر کہاں رہے

○

ہو جو گرم نہ کردے وہ آرزو کیا ہے
تجھے بھی بھول گئے تیرے ڈھونڈنے والے
غلط سمجھ کے نہیں دیکھتا ہوں تیری طرف
جنھیں ہے تجھ سے محبت وہ جانتے بھی نہیں

جو آرزو سے نہ گرمائے وہ لہو کیا ہے
یہ ہوش بھی تو نہیں ہے کہ جستجو کیا ہے
یہ دیکھتا ہوں کہ اندازِ گفتگو کیا ہے
کہ رشک کہتے ہیں کس چیز کو عدو کیا ہے

○

یہ عالم ہے کسی کے حُسن کی نازک ادائی کا
جو ناکردہ گنہ کی طرح باقی کوئی رہ جائے
محبت کے نہایت نازک احساسات ہوتے ہیں
کسی کے دل کی دھڑکن تک کوئی محسوس کرتا ہے
معاذ اللہ شیخ و برہمن کا ظاہر و باطن
شروعِ عشق سے گویا وفاؤں ہی میں گزری تھی
گنہگاری مری عینِ مشیّت ہے مگر بسملؔ

مجھے احساس مشکل ہے ستم کی نارَوائی کا
وہی سجدہ ہے تیرے در پہ حاصل جبہ سائی کا
شگفتِ گُل یہ بھی ہوتا ہے دھوکا جگ ہنسائی کا
محبت میں یہ اک عالم بھی ہوتا ہے جدائی کا
گناہوں نے پہن رکھا ہے جامہ پارسائی کا
کیا کچھ اس ادا سے عذر اس نے بےوفائی کا
مجھے باغی کہا جاتا ہے احکامِ خدائی کا

○

ناکام اٹھنے والے بھی اُس بزمِ ناز سے
وہ بےنیازِ شوق بھی شوق آفریں بھی ہے
دیکھا او وطن کی شام، سرِ راہ صبح سے

اٹھتے ہیں اک اُمید کی دُنیا لیے ہوئے
بےالتفاتیوں میں تقاضا لیے ہوئے
بیٹھا ہوں بے کسی کا جنازہ لیے ہوئے

○

بیانِ حُسن کے قابل کہاں زباں میری

بقدرِ عشق نہیں طاقتِ بیاں میری

بغیر عزم و ارادہ ہیں کار دارِ جنوں
نہیں ہے میری طبیعت بھی رازداں میری
یقیں نہ آئے کسی اور کی طرف سے مجھے
اگر سنائے کوئی مجھ کو داستاں میری
ہر ایک چیز ادا کر رہی ہے فرض اپنا
بیانِ غیر کا، بزم اُن کی داستاں میری
وہ باوفا نہ عدو باوفا مگر بسملؔ
یہ قہر ہے کہ محبت ہے درمیاں میری

○

محبت نے کسی کی چھین لی ہے زندگی اپنی
نہ اب کوئی غم اپنا ہے نہ اب کوئی خوشی اپنی
وہ لمحے بیکسانِ عشق کے ننگِ محبت ہیں
کہ جن لمحوں میں ہو محسوس ان کو بے کسی اپنی
نہیں اپنے کسی مقصد سے خالی کوئی بھی سجدہ
خدا کے نام سے کرتا ہے انساں بندگی اپنی
خوشی کے نام سے نفرت ہے جب سے ہم یہ سمجھے ہیں
کہ بنتی ہے کسی ناشاد کے غم سے خوشی اپنی
وہ شاید زندگی سے قبل اپنی موت تھی بسملؔ
کسی کے عشق سے پہلے جو گزری زندگی اپنی

○

یہ دیتے ہیں مجھے طعنے تری نامہربانی کے
جو میرا حال مجھ سے پوچھتے ہیں مہربانی سے
معاذ اللہ بسملؔ آپ اندازہ لگاتے ہیں
خدا کی مہربانی کا بتوں کی مہربانی سے

○

کبھی مانوسِ تمنا نہیں دیکھا تم کو
چاہے جاتے ہیں مگر اہلِ تمنا تم کو
اپنی ناکام نگاہوں کی قسم کھاتا ہوں
جو تمھیں دیکھ سکا اس نے نہ دیکھا تم کو
دِل دھڑکنے ہی لگا آنکھ جھپکنے ہی لگی
باوجودے کہ بہت دُور سے دیکھا تم کو
اے زہے عشرتِ نظارہ و معراجِ نظر
میں نے جب اپنی طرف دیکھتے دیکھا تم کو
مجھ کو ہر ظلم گوارا ہے تمھارا لیکن
یہ گوارا نہیں کہتی ہے جو دُنیا تم کو
ناروا اُن کی ہر اک بات ہو بسملؔ لیکن
اُن سے یہ کون کہے یہ نہیں زیبا تم کو

○

جتنا ہوں تجھ سے پاس میں اُتنا ہی دُور ہوں
بڑھتی ہے یعنی بے خبری آگہی کے ساتھ
ہے پرسشِ فرائض و اعمال روزِ حشر
ماخوذ خضر بھی ہیں مری گمرہی کے ساتھ
کیا فرض ہے ہر ایک گنہ کا مواخذہ
شرطِ قبولیت ہے اگر بندگی کے ساتھ
تنہائی میں تو لطفِ عبادت ہی خوب ہے
بسملؔ مزہ شراب کا آتا ہے پی کے ساتھ

○

اس طرح دنیا میں دل کو محرمِ غم کیجیے
جب خوشی کوئی میسّر ہو تو ماتم کیجیے

دیکھ کر اہلِ طرب کا ساز و سامانِ طرب
بدنصیبوں کا ذرا اندازۂ غم کیجیے

جانے کس عالم کی حسرت میں ہیں نظریں مضطرب
ورنہ کیا نظارۂ حسنِ دو عالم کیجیے

غم کو ہونے دیجیے ہو جس قدر مانوسِ دل
دل کو جتنا ہو سکے بیگانۂ غم کیجیے

تا کجا آوارۂ نظارہ چشمِ حسنِ دوست
جمع اک مرکز پہ کیوں کر حسنِ عالم کیجیے

○

جو تجھ پہ مرتے ہیں کس بات پر وہ مرتے ہیں
کسی کی موت پہ تو سوگوار بھی تو نہیں

کسی کے غم کی یہ مجبوریاں معاذ اللہ
مجالِ خندۂ بے اختیار بھی تو نہیں

○

دل میں کیا صرف حسرتِ پرواز
دے پروں کو بھی زحمتِ پرواز

ہے پرِ کاہ بھی پرِ جبریل
گر میسّر ہو جرأتِ پرواز

کوئی ہو بھی فضا شناسِ چمن
کس سے کہیے نزاکتِ پرواز

یہ بھی ہے اک فریبِ صیادی
کون دیتا ہے مہلتِ پرواز

مرحمت کر کے بال و پرِ بسمل
سلب کر لی ہے طاقتِ پرواز

○

مطمئن ہم ہیں زندگانی سے
اے اجل تیری پاسبانی سے

غنچۂ دل کھلے گا اب کیا خاک
میری تربت پہ گل فشانی سے

کیا کوئی شہرِ دل بچا ہوگا
اس محبت کی حکمرانی سے

کس قدر ہے پسندِ خاطرِ عشق
نیند اڑ جائے جس کہانی سے

حسن اور عشق تو بہانے ہیں
موت کو لاگ ہے جوانی سے

ہم رہے چپ تو وہ ہوئے خاموش
بن گئی بات بے زبانی سے

پھر بھی اچھا ہے میرا حال ابھی
تم نہ پوچھو جو مہربانی سے

○

زیادہ ناامیدِ عافیت دل ہوتا جاتا ہے
سفینہ جس قدر نزدیکِ ساحل ہوتا جاتا ہے

تغیّر آشنائے بزمِ ہر دل ہوتا جاتا ہے
کسی کو کیا خبر کیا رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

جدھر منہ پھیرتا جاتا ہوں گھبرا کر تصور سے
وہ حسنِ ہر جہت میرے مقابل ہوتا جاتا ہے

تری محفل بھی کتنی ہم مزاجِ عشق ہے ظالم
جو آتا ہے شریکِ رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

شروعِ عشق میں یہ صورتِ حالات ہے باہم
اِک آئینے کے آئینہ مقابل ہوتا جاتا ہے

○

کسی سے تو کسی کی موت ہی دیکھی نہیں جاتی
مگر مجھ سے تو اپنی زندگی دیکھی نہیں جاتی

تمھارے در سے ہم ناکام اٹھ کر آئے ہیں جب سے
کسی در پر جبینِ بندگی دیکھی نہیں جاتی

مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر او دیکھنے والے
تری نظروں کی بیگانگی دیکھی نہیں جاتی

وہ کچھ اس طرح مجھ کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں
کہ جیسے میری حالت واقعی دیکھی نہیں جاتی

لرزتا تھا کبھی دِل مرگِ بسمل کے تصوّر سے
مگر کم بخت کی اب زندگی دیکھی نہیں جاتی

○

التجائیں کرنے والے کو دُعا سے کیا غرض
جس کو ہو تم سے غرض اس کو خدا سے کیا غرض

اب گھٹائیں میکدے پر چھائیں تو میں کیا کروں
بے دلی کو دعوتِ آب و ہوا سے کیا غرض

اب دلِ ناکام میں وہ نالہ و نغمہ کہاں
بسمل اِک سازِ شکستہ کو صدا سے کیا غرض

○

اس طرح جذباتِ آزادی بہل جائیں گے کیا
بن رہا ہے کیوں قفس میں آشیاں میرے لیے

رو رہا ہوں آج میں سارے جہاں کے واسطے
روئے گا کل دیکھنا سارا جہاں میرے لیے

○

دیکھوں نہ سوئے خلد، اُٹھا کر نگاہ بھی
اے حسنِ اتفاق اِک ایسا گناہ بھی

اِک آرزوئے شوق ہے جس پر الگ الگ
میری نگاہ بھی ہے، تمھاری نگاہ بھی

کیا چیز دل میں ہے کہ ابھی ناتمام ہے
حالانکہ کامیاب ہے دل بھی، نگاہ بھی

○

عبرت کا مُرقّع ہیں دنیا میں وہ ویرانے
باقی ہیں ابھی جن کی آبادی کے افسانے

محرابِ حرم! کب تک سجدوں کی یہ ناقدری
دینے نہ لگیں مجھ کو آواز صنم خانے

ملحوظ نہیں جن کی عشرت میں خوشی تیری
وہ عیش محل اک دن بن جائیں گے غم خانے

کل تک تو تجھے بسمل غیروں کی مروّت تھی
آج اپنوں سے جاتا ہے منہ پھیر کے بیگانے!

○

مشکل تو عشق میری وفا سے بھی تھا مگر
تیری وفا نے اور بھی مشکل بنا دیا

سودا سہی جنون سہی ناشقی مگر
سر آستانِ یار کے قابل بنا دیا

○

دلدادۂ حسن آپ کو کچھ کم نہ ملیں گے
مل جائیں گے ہم سے بھی مگر ہم نہ ملیں گے

جس روز یہ چاہیں گے مجھے تم سے ملانا
اس روز یہ دن رات ہی باہم نہ ملیں گے

گر تم متوجہ بھی ہوئے صورتِ خورشید
ہم تو صفتِ دیدۂ شبنم نہ ملیں گے

○

پاس رہتا ہے، دور رہتا ہے
درمیاں میں وہ ضرور رہتا ہے

ہائے اُس کی نوازشِ پنہاں
کس قدر دور دور رہتا ہے

شوق کی کامیابیاں تسلیم
دل مگر ناصبور رہتا ہے

حاصلِ عشق ہے یہی بسمل
نہ جو دل پر سرور رہتا ہے

○

لذتِ عشق تمہی سے روح کا یہ عالم ہے
اور ابھی حسن تو احساس کے شامل ہی نہیں

خود نہ بڑھ آئے اگر حسن ہی تا منزلِ عشق
منزلِ عشق سے آگے کوئی منزل ہی نہیں

کبھی مسجودِ نظر بھی تو ہو، اے کعبۂ روح!
آرزومند یہ آنکھیں بھی تو ہیں، دل ہی نہیں

سہل ہو گی مری مشکل تو تمہیں سے ہو گی
کہ کسی اور کو اندازۂ مشکل ہی نہیں

○

تھی کاہشِ فراق ابھی کیوں وصال میں
کیا تم چلے گئے تھے کسی کے خیال میں

باقی ہے کیا ابھی کوئی حسرت گناہ کی
دل کیوں نہیں شریک مرے انفعال میں

راتیں اُسی کی، دن ہیں اُسی خوش نصیب کے
وہ جس کے خواب میں ہیں وہ جس کے خیال میں

○

نخوت و ناز کا پھر اُس کے ٹھکانا کیا ہے
بے نیازی ہو صفت جس کے طلب گاروں کی

موت آزاد کیے دیتی ہے ایک اک کر کے
کچھ خبر بھی ہے تمہیں اپنے گرفتاروں کی

مجھ سے نفرت بھی ہے اندازۂ غم کا بھی ہے شوق
دیکھ لیتے ہیں وہ صورت مرے غم خواروں کی

○

بنتی رہتی ہیں نگاہیں میری آئینہ اُن کی خود آرائی کا
جو جہاں ہے، وہیں تجھ سے ہے قریب ہے کمال انجمن آرائی کا
بسمل اب ختم ہے ذلت پہ مری سلسلہ عزتِ آبائی کا

○

ربابِ دہر پہ ہے کون زخمہ زن یارب صدائے نغمہ ہی نوحے کی اک صدا بھی ہے
بغیر عشق میسّر کسے مراتبِ عشق اگر حسین کوئی ہو تو کربلا بھی ہے

○

وقت کب تک گزاریے آخر یوں کہیں زندگی گزرتی ہے
حالِ دل اب کسی سے کیا کہیے جو گزرتی ہے وہ گزرتی ہے
شعر کی فکر ہو گئی الہام دل پر اک وحی سی اترتی ہے
میں ہوں اب اور وہ زندگی بسمل موت جس زندگی سے ڈرتی ہے

○

مجھے جنونِ محبت نے اس جہاں میں رکھا کہ جس جہاں میں کوئی انقلاب آ نہ سکا
قیودِ عشق سے شاید گزر گیا ہو کوئی حدودِ حسن سے لیکن نکل کے جا نہ سکا
نہ بن گیا ہو ترا عشق اضطراب کہیں تسلیوں سے تری اضطراب جا نہ سکا

○

جبینِ شوق رہ سکتی تھی جذبِ آستاں ہو کر اگر یہ ذوقِ سجدہ رہ نہ جاتا درمیاں ہو کر
فغاں اک قہقہہ بن کر نکلتی تھی کبھی دل سے مگر اب قہقہہ منہ سے نکلتا ہے فغاں ہو کر
ہوئے ہیں خاک اپنے کارواں جن رہگزاروں میں کل اُن کی خاک کے ذرّے اٹھیں گے کارواں ہو کر
فرشتوں کی جبیں جھکتی تھی بسمل جس کے قدموں پر وہ انساں مر گیا سجدہ گزارِ این و آں ہو کر

○

ہو کسی کی داستاں، میرا ہی افسانہ ہے وہ ہاں مگر اُس میں تمہارا نام ہونا چاہیے
دیکھ کر بسمل تمہاری زندگی، آیا خیال زندگی کا موت بھی اک نام ہونا چاہیے

○

جب اہلِ عشق کا ہر حال عاشقانہ تھا حدودِ عشق سے [illegible]

بُھلا دیا ترے کانٹوں نے بھی چمن ہم کو
ہمارا تیری بہاروں میں آشیانہ تھا
ترے غرور نے ٹھکرا کے جس کو پھینک دیا
مری جبیں وہ نہ تھی تیرا آستانہ تھا
اب آنسوؤں نے حقیقت بیان کی اُس کی
جو قہقہوں کی زباں پر کبھی فسانہ تھا

○

اب ہم نہیں اور پیچ و خمِ راہِ زندگی
اب ہم کہاں وہ زلفِ شکن در شکن کہاں
کس طرح چل سکیں گے زمانے کے ساتھ ہم
جو وقت کی روش ہے وہ اپنا چلن کہاں
بسملؔ فضول ہے یہ غمِ مرگِ بے کسی
ہر لاش کے نصیب میں گور و کفن کہاں

○

خموش رات کی حسرت نوائی سُنتا ہوں
مہ و نجوم کی نغمہ سرائی سُنتا ہوں
تمہارے واسطے میں خود تو کچھ نہیں کہتا
مگر جو کہتی ہے ساری خدائی سنتا ہوں
یہ سوچتا ہوں کہ حد بھی ہے کوئی جرأت کی
جب اُن کے مُنہ سے ستم کی بُرائی سنتا ہوں
کچھ اجنبی سا ہے اپنے وجود کا احساس
صدائیں ساز سے دل کے پرائی سنتا ہوں

○

عشقِ اداشناس ہے رمزِ تغافل آشنا
آئی ہے اب خصوصیت آپ کے التفات میں
وائے فسردگیِ روح ہائے شکستگیِ دل
ٹیس سی سانس سانس میں ٹھیس سی بات بات میں
اُن کو اگر خوشی نصیب ہے تو وہ کس بنا پہ ہے
اے غمِ عشق تو نہیں جن کے مقدرات میں

○

جستجو ٹھوکریں کھلاتی ہے
اور منزل پہ بھی پہنچاتی ہے
نااُمیدی ہے بُری چیز مگر
ایک تسکین سی ہو جاتی ہے
یاد کرتا ہوں تجھے میں جس وقت
کیا تجھے بھی مری یاد آتی ہے
دل میں جس بات کا اندیشہ ہو
ایک دن سامنے آ جاتی ہے
انتہا تک وہ سنبھلتا ہی نہیں
ابتدا جس کی بگڑ جاتی ہے
بسملؔ اب چھوڑ دو ان باتوں کو
عمر برباد ہوئی جاتی ہے

○

کوئی چیز ایسی ہو آپس میں یہ ٹکرانے نہ پائیں
ایک میخانہ بنے دیر و حرم کے درمیاں

جیسے اُن کی یاد میں، شامل ہو اپنی یاد بھی
اس طرح آنے لگی ہے دل میں یادِ رفتگاں

اک کلی اُمید کی مرجھا کے یہ کیا کر گئی
مجھ سے اب دیکھا نہیں جاتا ہے سوئے گلستاں

اب یہیں بیٹھے کہیں دیکھو تو جیسے نقشِ پا
اور کہیں چلتے کوئی دیکھے تو اک اشکِ رواں

وہ دمِ رخصت کسی کی اک نگاہِ ناتمام
دل میں ٹوٹا ہے وہ اک نشتر کہ بسمل، الاماں

○

یہ پہچاننا اب ان کو دشوار ہو گیا ہے
جو لوگ اپنے جانے پہچانے رہ گئے ہیں

قبروں میں سونے والو، تم کو پکارتے ہیں
عشرت کدے جو بن کر غم خانے رہ گئے ہیں

دیکھا اے نگاہِ عبرت، آثارِ عہدِ ماضی
آبادیوں کے ہو کر ویرانے رہ گئے ہیں

اے شمعِ صبحِ محفل اِن کو جلا کے بجھنا
دو چار اور تیرے پروانے رہ گئے ہیں

○

یہاں ہر چیز جنّت کی فراہم ہوتی جاتی ہے
مگر دنیا کو دیکھو تو جہنّم ہوتی جاتی ہے

○

لاکھ شمعیں سہی مزاروں پر
روشنی تو نہیں مزاروں میں

○

اب عشق رہا نہ وہ جنوں ہے
طوفان کے بعد کا سکوں ہے

احساس کو ضد ہے دردِ دل سے
کم ہو تو یہ جانیے فزوں ہے

اظہار ہے دردِ دل کا بسمل
الہام نہ شاعری فسوں ہے

○

کیا لوگ ہیں یہ لوگ، جہاں کیا جہاں ہے یہ
کیا کارواں ہے، کیا یہ سرا ہے کہ ہائے ہائے

اُڑتا ہے اُس ہوا سے بقدرِ نفس جو ہے
تصویر میں وہ رنگ بھرا ہے کہ ہائے ہائے

نغمہ سُنے تو جان کے نوحہ لرز اُٹھے
کتنا یہ دل غموں سے بھرا ہے کہ ہائے ہائے

بسمل کا رنج دل سے بھلایا نہ جائے گا
کس بے کسی کی موت مرا ہے کہ ہائے ہائے

○

بڑھ جائیں عدم سے ہم اُدھر اور زیادہ
پائیں جو تری راہ گزر اور زیادہ

ہو جائے جبیں جذبِ درِ ناز الٰہی
جھک جائے درِ ناز پہ سر اور زیادہ

میں حشر کے دن بھی نہ اٹھوں گا شہ یہاں سے
کچھ دن ہوں ترے در پہ بسر اور زیادہ
اے شامِ غمِ عشق فزوں ہو تری ظلمت
روشن نظر آتی ہے سحر اور زیادہ
کیا دیکھتے ہو در پہ ہجومِ اہلِ جنوں کا
بیٹھے ہیں سرِ راہ گزر اور زیادہ
اندیشۂ رسوائی توجہ میں تو کم ہے
پھیلے گی تغافل سے خبر اور زیادہ
پردے کے لیے بند نہ چاہو مری آنکھیں
اس طرح تو آتے ہو نظر اور زیادہ
دیکھا ہے رہِ ترکِ محبت پہ بھی چل کر
دشوار ہے یہ راہ گزر اور زیادہ
کس درجہ المناک ہیں شام و سحرِ عشق
شام اور زیادہ ہے سحر اور زیادہ
بسمل جو کہیں دیکھتے قدر اپنے ہنر کی
کرتے ہم ابھی عرضِ ہنر اور زیادہ

○

بیٹھا نہیں ہوں سایۂ دیوار دیکھ کر
ٹھہرا ہوا ہوں وقت کی رفتار دیکھ کر
ہیں آج تک نگاہ میں، حالانکہ آج تک
دیکھا نہ پھر کبھی انھیں اک بار دیکھ کر
بسمل تم آج روتے ہو انجامِ عشق کو
ہم کل سمجھ گئے تھے کچھ آثار دیکھ کر

○

مقصود جس کا کوئی تمہارے سوا نہیں
وہ راہ زندگی کو دکھائے ہوئے ہو تم
ہر راہِ زندگی میں اسی کی ہے روشنی
دل میں جو ایک شمع جلائے ہوئے ہو تم
مشتاقِ بازدید ہے وہ بسملِ حزیں
اک بار جس کے سامنے آئے ہوئے ہو تم

○

سمجھ سکے گا کوئی کیونکر اس کی بربادی
اگر کسی کے کرم کا ہو کوئی فریادی
یہ کیا کیا تری تسکینِ نامکمل نے
سلگ رہی تھی جو دل میں وہ آگ بھڑکا دی
ہے وعدۂ فردا اگر یہی کیوں کوئی
نصیبِ وعدۂ فردا نہ ہو جو آزادی
نہ کرشمۂ تقریر و لذتِ تقریر
الجھ گیا ہوں اسی میں جو بات سمجھا دی
گزر سکے نہ کسی طرح زندگی بسمل
ذرا سی دیر کو یوں زندگی گزروا دی

○

تھا شوق مجھے تم سے ملاقات کا لیکن
میں خود نہیں آیا تھا بلایا تھا تمہیں نے
ہے کبھی ختم ہی لے اس کی نہ ہو گی
نغمہ وہ مرے سامنے گایا تھا تمہیں نے

میں یاد دلاتا ہوں اگر بھول گئے ہو
اک رنج مرے دل سے بھلایا تھا تمھیں نے

جس تجربۂ عشق پہ رویا تھا میں اک روز
ہنس کر اُسے باتوں میں اُڑایا تھا تمھیں نے

آزردہ انجام وہ بسمل ہے تمھیں سے
آغاز میں مُنہ جس کو لگایا تھا تمھیں نے

○

خدا کرے مجھے دم بھر کو بھی نصیب نہ ہو
وہ زندگی جسے تیری خوشی نصیب نہ ہو

جو سر جُھکا ہو کہیں تیرے آستاں کے سوا
مری جبیں کو تری بندگی نصیب نہ ہو

اگر پیا ہو کسی چشمِ مست کا ساغر
تری نظر سے مجھے مے کشی نصیب نہ ہو

اگر ہوا ہوں میں آلودہ شباب کہیں
ترے جمال کی پاکیزگی نصیب نہ ہو

اگر نہ ہو تری خاطر سے پاسِ دشمن بھی
خدا کرے کہ تری دوستی نصیب نہ ہو

اگر نہ ہو تری تصویر مونسِ بسمل
تو بدنصیب کو صورت تری نصیب نہ ہو

○

اپنے وعدوں کو فراموش نہ کر دینا تھا
سازِ الطاف کو خاموش نہ کر دینا تھا

ہر نفس موت کے قدموں کی صدا سننے کو
زندگی کو ہمہ تن گوش نہ کر دینا تھا

آنسوؤں میں فقط اب مجھ کو نظر آتے ہو
اس طرح تو مجھے غم کوش نہ کر دینا تھا

اس طرح زحمتِ فردا کو بڑھانے کے لیے
مجھ کو خمیازہ کشِ دوش نہ کر دینا تھا

آنکھ میں دیکھ کے آنسو مجھے رشک آتا ہے
اتنا ویران تو آغوش نہ کر دینا تھا

○

اک تری جانب سے کیا محرومِ نظارہ ہوئیں
میری نظروں کا بہشتِ چار سو بن جاتا

تجھ سے محرومِ تکلم ہو کے اوروں سے تو کیا
اپنے دل سے بھی تو لطفِ گفتگو ہوتا

تجھ سے بھی بچ بچ کے تجھ کو کر رہا ہوں یوں تلاش
تو یہ سمجھے اب جنونِ جستجو جاتا

○

تم اپنے قول تم اپنے قرار یاد کرو
اور اُن پہ کچھ وہ مرا عتاب یاد کرو

جو مجھ پہ اب نہ رہیں اُن نوازشوں کی قسم
نوازشوں سے وہ دلیل و حجاب یاد کرو

تمام دن مری حسرت میں روزنِ در سے
نگاہِ شوق سے وہ گزار یاد کرو

وہ شرم و شوق کے ہیجان میں شبِ مہتاب
تمام رات مرا انتظار یاد کرو

ذرا خلافِ توقع مرے پہنچنے پر
وہ طرزِ گفتگو بیگانہ وار یاد کرو

کبھی وہ آپ ہی بے چین ہو کے رہ جانا
کبھی وہ مجھ پہ بھی اک اختیار یاد کرو

ذرا سکوت پہ میرے وہ سوچو تو ہم سے
مری طرف نگہِ بے قرار یاد کرو

مری جدائی گوارا ہوئی تمھیں کیونکر
تمھیں یہ ذکر بھی تھا ناگوار یاد کرو

خدا کرے کبھی بے اختیار یاد آؤں
خدا کرے کبھی بے اختیار یاد کرو

بھلا چکے سو بھلا ہی چکے وہ [illegible] بسمل
ہزار یاد دلاؤں ہزار یاد کرو

○

جفا نا آشنا رہنا وفا نا آشنا رہنا
ابھی دیکھا نہیں تم نے محبت کا خفا رہنا

تمہاری بے نیازی ہی نے مجھ کو بھی سکھایا ہے
تمہارے پاس بھی رہنا مگر تم سے جدا رہنا

مرے دستِ طلب، میری نگاہِ شوق سے پوچھو
نہ مصروفِ دعا رہنا نہ صرفِ التجا رہنا

تمنا بھی محبت ہی تھی مگر دل نے کہا بسمل
محبت بن کے جب رہنا تمنا بن کے کیا رہنا

○

دل کو سکونِ یاس گوارا نہیں مگر
اب اضطرابِ شوق کے شایاں نہیں ہوں میں

اپنی وفا سے لاکھ پشیماں سہی
لیکن تری جفا سے پشیماں نہیں ہوں میں

[illegible] خاکِ راہ ہوا تیرے لیے مگر
اندیشہ مندِ جنبشِ داماں نہیں ہوں میں

○

اپنی گستاخیِ سجدہ مجھے تسلیم، مگر
تیری سرکار میں سر اور بھی خم ہیں کہ نہیں

چند ذروں پہ نشانات نہیں کے بھی سہی
کوچۂ ناز میں کچھ نقشِ قدم ہیں کہ نہیں

ہوئے اخلاص و محبت سے بھی کبھی گوشۂ چشم
رابطے مصلحتوں سے کبھی باہم ہیں کہ نہیں

ہے ہمہ [illegible]، مرحمت و لطفِ تمام
ہیں جو اوروں پہ کرم مجھ پہ ستم ہیں کہ نہیں

○

بغیر آرزو [illegible] یا زندگی محبت کی
کہ آرزو ہی محبت کی جان ہے گویا

ادھر ادھر مری آنکھیں تجھے پکارتی ہیں
مری نگاہ نہیں ہے زبان ہے گویا

ترا ہی نام [illegible] جس کو دوا آواز
کوئی خیال ہو، تیرا ہی دھیان ہے گویا

[illegible] مرا تجھی سے ہے، لیکن
مرے لیے یہ زمین، آسمان ہے گویا

○

شبِ غم عیش کا مژدہ سنانے کون آتا ہے
یہ میرے آنسوؤں میں مسکرانے کون آتا ہے
بیابانک تیرگی میں غم کی جب دم گھٹنے لگتا ہے
چراغِ گشتۂ عشرت جلانے کون آتا ہے
وفورِ یاس کر دیتا ہے جب لبریزِ غم دل کو
خوشی بن کر مرے دل میں سمانے کون آتا ہے
اجل کے تیز قدموں کی جب آہٹ آنے لگتی ہے
باندازِ مسیحائی سرہانے کون آتا ہے

○

ہوئے تمام ستم شاملِ شمارِ کرم
ستم کے بعد کچھ ایسے کرم نصیب ہوئے
خوشی بھی ایسی کسی کو نہ مل سکی ہوگی
کہ جیسے ہم کو محبت میں غم نصیب ہوئے

○

اُن کا جمال اور مرے آغوشِ شوق میں
ذرّے کو مل کے مہر کی تابندگی رہی
اس طرح جذبِ روح ہوئی وہ نگاہِ ناز
رگ رگ میں پھلجھڑی سی کوئی چھوٹتی رہی
محجوب مجھ کو شوقِ فراواں پہ دیکھ کر
خود طبعِ نازنیں پہ گراں ناز کی رہی
اک موجِ بوئے گل تھی کہ لہجے کا لوچ تھا
جس میں شراب اور بھی رس گھولتی رہی
حالانکہ چاند رات بھر اس شب نہ رہ سکا
اُن پر تمام رات مگر چاندنی رہی
صبحِ حریمِ حسن کی کیفیتیں نہ پوچھ
چھائی ہوئی فضاؤں پہ وارفتگی رہی
اٹھ کر وہ خوابِ ناز سے کچھ اس طرح چلے
موجِ نسیمِ صبح قدم چومتی رہی
گل رنگ رخ پہ تھی وہ صباحت کی اک جھلک
صبحِ بہار بار ہا بھی منہ دیکھتی رہی
میری نگاہِ شوق کو اس رخ پہ دیکھ کر
شبنم کو برگِ گل سے کرن چوستی رہی
انفاس میں شراب کی خوشبو کو دیکھ کر
دیوانہ وار نکہتِ گل سونگھتی رہی
بسمل اٹھیں نہ ان کی نگاہیں کسی طرف
پھولوں کی جلوہ گاہ انھیں دیکھتی رہی

○

سمجھا تھا نہ میں عشرتِ رفتہ کی یہ تاثیر
ہر جنبشِ اندوہ اثر ہو کے رہے گی
نغمات کی لے نالۂ شب گیر بنے گی
آوازِ رباب آہِ سحر ہو کے رہے گی
ہو جائیں گے مایوسِ صدا گوشِ تمنا
نظارے سے محرومِ نظر ہو کے رہے گی

○

غیر ممکن بھی ہے ممکن مجھے معلوم نہ تھا
ایک دن آئے گا یہ دن مجھے معلوم نہ تھا

اور کچھ میں ترے ظاہر نے سمجھا تھا تجھے
اور کچھ ہے ترا باطن مجھے معلوم نہ تھا

اپنے دامانِ تصنّع میں چھپا سکتے ہیں
اِن معائب کو محاسن مجھے معلوم نہ تھا

دشمنی کے لیے مخصوص ہے جو طرزِ عمل
دوستی میں بھی ہے ممکن مجھے معلوم نہ تھا

○

حریمِ حسن سے میں بے وقار ہو آیا
نگاہِ عشق میں بے اعتبار ہو آیا

تاثرات میں اپنے بہت ہی نازک ہے
وہ حادثہ کہ میں جس سے دوچار ہو آیا

جو ناگوارِ تصوّر ہو کیا کسی سے کہوں
جسے میں خود نہ سنوں وہ پکار ہو آیا

طبیعت اپنی ہی جانب سے کچھ مکدّر ہے
میں اپنے دل کے لیے خود غبار ہو آیا

نہ زندگی کو قبول، اور نہ موت کو منظور
عجیب واقعۂ ناگوار ہو آیا

گراں ہوں دوشِ دو عالم پہ میں سبک ہو کر
جو اٹھ سکے نہ کسی سے وہ بار ہو آیا

نگاہِ ناز کی بے التفاتیوں کی قسم
سرور بن کے گیا تھا، خمار ہو آیا

جنونِ عشق نے بسمل کیا ذلیل مگر
فریبِ حسن سے میں ہوشیار ہو آیا

○

تلخیِ نامہربانی ہائے دنیا، آہ جب
دل کسی کی مہربانی سے بھی گھبرانے لگے

دم بدم لحظہ بہ لحظہ وہ فراوانیِ غم
جب کوئی ساعت گزر جائے تو یاد آنے لگے

آہ، تسلسل زندگیِ غم کی وہ نوبت کہ جب
جامۂ ہستی سے بدبو موت کی آنے لگے

○

افسردگیِ شوق میں دل گدگدائے کون
تیرے غمِ فراق کو دل سے بھلائے کون

جس طرح کھل گئے ہوں دریچے بہشت کے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے یوں مسکرائے کون

دل سے ترے خیال نے سب کچھ بھلا دیا
لیکن ترے خیال کو دل سے بھلائے کون

○

دنیا ہوئی ہے اے دلِ ناکام اجنبی
ہر صبح اجنبی ہے، ہر اک شام اجنبی

کیا ہو گیا ہے یہ کہ خود اپنے ہی گھر میں آج
محسوس ہو رہے ہیں در و بام اجنبی

کھلتا نہیں ہے عالمِ بیگانگی کا راز
لمحے خوشی کے، رنج کا ہنگام اجنبی

جس راہِ زندگی پہ چلا ہوں تمام عمر
محسوس ہو رہی ہے بہ ہر گام اجنبی

یارب لباسِ رندی و مستی ہے یا کفن
مانندِ وضعِ جامۂ احرام اجنبی

جیسے یہ میکدہ ہو کوئی اور میکدہ
ساقی ہے اجنبی، مئے گلفام اجنبی

اپنا ہی عکس جام میں آتا ہے اب نظر
پرتو کسی کا جیسے سرِ جام اجنبی

شمعِ سحر ہو بزم میں بیگانہ جس طرح
ہے اس طرح چراغِ سرِ شام اجنبی

اِس زندگی سے جن کا تعلق نہیں کوئی
آنے لگے ہیں دل میں کچھ اوہام اجنبی

بسملؔ کے نام سے جو پکارے کوئی مجھے
سُنتا ہوں جیسے ہو یہ کوئی نام اجنبی

○

میرے گھر کے در و دیوار ابھی باقی ہیں
غم زدہ دل کے یہ غمخوار ابھی باقی ہیں

دل کو ڈھا کر مرے تیشہ نہ رکھیں ہاتھ سے آپ
اس عمارت کے کچھ آثار ابھی باقی ہیں

○

ربابِ عشق، نہ مضرابِ حُسن، کچھ بھی نہیں
وہ نغمہ ہائے تمنّا، نہ وہ صدائیں رہیں

بدل گئے سحر و شامِ زندگی بسملؔ
وہ زندگی کے مناظر، نہ وہ فضائیں رہیں

○

بسا ہُوا ہے کس انداز پر دیارِ اجل
مکیں تو خاک ملے گا، یہاں مکاں نہ ملا

مسافرانِ عدم کس طرف سے جاتے ہیں
کسی طرف بھی کوئی نقشِ کارواں نہ ملا

کہیں تڑپ تو اُٹھے میرے پیار کے سجدے
مگر جبیں کو مری کوئی آستاں نہ ملا

○

اِس طرح عشق کی تقسیم ہوئی روزِ ازل
دل کی تقدیر غم، آنکھوں کا مقدّر آنسو

ضبطِ گریہ سے جو آنکھوں میں کھٹک ہوتی ہے
خشک ہوتے ہیں تو ہو جاتے ہیں کنکر آنسو

خاک میں مل کے مرے اشک بھی مجھ کو نہ ملے
قہقہے کاٹتے ہیں لوگ تو بو کر آنسو

دیکھ لیں میرے سراپا کو مری آنکھوں سے
دیکھنا چاہیں جو اپنا کوئی پیکر آنسو

میں کبھی دل میں کبھی رُوح میں رکھ لیتا ہوں
وقت بے وقت کو آنکھوں سے چھپا کر آنسو

جن کو رونا ہو وہ ہنس ہنس کے بھی رو لیتے ہیں
قہقہوں میں بھی بدل جاتے ہیں اکثر آنسو

ایک مہکا ہوا فردوس، مشامِ غم ہے
ہیں تری یاد کی خوشبو سے معطّر آنسو

چشمِ نابینا میں آجائیں تو بینا ہو جائے
ہیں تصوّر سے ترے کتنے منوّر آنسو

بہہ کر آنکھوں سے جو پہنچیں یہ ترے مرقد تک
میری آنکھوں کو بھی لے جائیں بہا کر آنسو
ابھر آیا جو ترا پرتوِ رنگیں ان میں
بن گئے پھول تری قبر پہ گر کر آنسو

○

ہائے یہ وحشتِ دل، وائے یہ شوریدہ سری
گھر کو میں بے در و دیوار کروں یا نہ کروں
وردِ لب نام ترا دل میں تری یاد کی آگ
ضبطِ انفاس سے شرربار کروں یا نہ کروں
نہ بھلا دے کہیں تجھ کو مری غمخواری میں
میں تری یاد کو غمخوار کروں یا نہ کروں
زندگی مرگِ مسلسل ہو تو بسمل اک دن
سہل یہ مُردنِ دشوار کروں یا نہ کروں

○

جو مرا خیال بھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں
تو مری مجال بھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں
کوئی دل بھلا سکا ہو اگر اپنی دھڑکنوں کو
تو کوئی مثال بھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں
یہ زوالِ عقل بہتر کہ بھلا سکوں نہ تجھ کو
وہ اگر کمال بھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں
مری موت بن کر آئے وہ خیال، جانِ بسمل
جو مجھے خیال بھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں

○

ہر ایک راہ میں یوں ان کو عمر بھر دیکھا
قدم قدم پہ ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا
دکھا سکیں گی نہ وہ سو قیامتیں بسمل
جو حشر میں نے ثریا کی قبر پر دیکھا

○

تری اجل سے ہوا اعتبارِ حشر مجھے
اک اعتبار ہی کیا اب تو انتظار بھی ہے

○

احساسِ غم سے بھی اب محروم ہو گیا ہوں
حد سے زیادہ شاید مغموم ہو گیا ہوں

○

خلشِ خار سے نظروں کو بچانے والے
کل اِن آنکھوں میں نہ کھٹکے گُلِ تر کی صورت
کر گئے وہ مری آنکھوں کو نظر سے محروم
میری آنکھوں میں جو رہتے تھے نظر کی صورت

○

پھر زلزلہ اجل کا جنبش نہ دے سکا ہے
بنیادِ غم خوشی نے جب اُستوار کی ہے

○

یا الٰہی کیا یہی بس حاصلِ فریاد ہیں — یہ جو دو آنسو پڑے ہیں دامنِ فریاد میں

○

میری تقدیر کہ بدلیں تری نظریں مجھ سے — تیری نظروں سے تو تقدیر بدل جاتی ہے
زندگی بھر مجھے اُس راہ میں چلتے گزری — موت جس راہ سے کترا کے نکل جاتی ہے

○

سازِ دل میں کہیں بے زخمہ صدا ہوتی ہے — میری آواز میں آوازِ خدا ہوتی ہے

○

جو گزری تجھ پہ اے مظلوم وہ اس پر بھی گزرے گی
ترے ماضی کو ہم ظالم کا مستقبل سمجھتے ہیں
انھیں سے وسعتِ انسانیت محدود ہوتی ہے
زمیں کی سرحدوں کو جو حدِ فاصل سمجھتے ہیں

○

کس قدر تم سے محبت ہے مجھے — اس کی شاہد ہیں مری تنہائیاں

○

اُن کی صورت کا تصور ہے اب اتنا مبہم — جیسے دیکھا نہ ہو آنکھوں نے سنا ہو اُن کو
عذرِ معصومیتِ حسن پہ اللہ کرے — حشر میں میرے گناہوں کی سزا ہو اُن کو

○

ہائے وہ دو نامرادِ زیست جن کے درمیاں — زندگی نے موت کی دُوری کو حائل کر دیا

○

اُن کے تبسموں نے تو مجھ کو بھلا دیا — اب شاید آنسوؤں کو کبھی یاد آ سکوں

○

اِن بے نیازیوں پہ کسے آئے گا یقیں — کس سے کہوں کہ حسن تمنا پسند ہے

○

کفن بھی لاش کو جس کی نہ ہو سکا تھا نصیب — اب اُس کی قبر پہ چادر چڑھائی جاتی ہے

○

کسی کی جدّتِ ظلم آفرینی کا تصرّف ہے
ذرا سا ہوش بھی کم بخت دیوانے میں رکھ دینا

○

اپنا اندازِ پذیرائی مجھے سمجھا دے
اس سے پہلے کہ ترے در کو جبیں ٹھکرا دے
مطمئن کوئی حرم پر کوئی بت خانے پر
جس کو جو کچھ نگہِ ناز تری سمجھا دے
یہ زمانہ ہے زمانے میں ہوں میں بھی تم بھی
نہیں معلوم یہ کس وقت کسے ٹھکرا دے

○

اب ہاتھ مل رہا ہوں میں وہ دن گزار کے
حاصل تھے ابتدا میں جو اک اعتبار کے
ہر صاحبِ نظر سے جدا ہے معاملہ
پردے پڑے ہوئے ہیں وہاں اعتبار کے

○

نشاں ہیں کتنی جبینوں کے آستاں پہ ترے
مری جبیں پہ کسی آستاں کا داغ نہیں
رہیں گواہ ستارے ترے شبستاں کے
کہ میری راتوں میں روشن کوئی چراغ نہیں

○

اندازِ جنوں عشق کے اب جا نہیں سکتے
تم بھی دلِ بیتاب کو سمجھا نہیں سکتے
اللہ کرے دل سے یہ احساس بھی مٹ جائے
شکوہ تو زباں پر ترا ہم لا نہیں سکتے

○

ہماری مرگِ نومیدی سلامت
جئیں گے ہم کسی امید پر کیا
جوابِ حسنِ روز افزوں اگر ہے
محبت ہے محبت بھی مگر کیا

○

نظّارۂ جمالِ سراپا کیے ہوئے
مدت ہوئی نگاہ کو سجدہ کیے ہوئے
اے مرگِ عشق آ کہ میں کب سے ہوں منتظر
ہر ناگوارِ زیست گوارا کیے ہوئے

○

اب مل گئی ہے خاک میں بسمل کی زندگی
کیا زندگی تھی خاک، مگر زندگی تو تھی

○

قہقہوں کی گونج میں خاموش آنسو بھی تو ہیں
عشرتوں کی کروٹوں میں غم کے پہلو بھی تو ہیں

○

تمھاری جیسی شباہت کو ڈھونڈتا تھا دل — تمھاری شکل نہ دیکھی تھی جس زمانے میں

○

نشیمن تو چمن میں پھر بناؤں گا مگر بجلی — جہاں اک بار گرتی ہے وہاں سو بار گرتی ہے
نزاکت غم کدوں کی عشق کے بسمل معاذ اللہ — کہ وزنِ سایۂ رہگیر سے دیوار گرتی ہے

○

تم سے دُنیا کو اگر دین بنایا نہ گیا — واعظو! دین کو دُنیا نہ بنایا ہوتا

○

آگیا ہوں وہاں سے گھبرا کر — اب کہیں دل بہل نہیں سکتا

○

ہنسنے میں یوں نمی تری آنکھوں میں آگئی — شبنم سے بھیگ جاتے ہیں جیسے چمن کے پھول
جس طرح شاخِ گل پہ ہوں رنگین تتلیاں — اِس طرح تیرے جسم پہ ہیں پیرہن کے پھول

○

مدّعا کہہ کے بھی باتوں میں لگائے رکھوں — ورنہ سوچیں گے خدا جانے وہ کیا کیا دل میں

○

جان اِس بے تعلقی پر بھی — بر بنائے تعلقات گئی
اُف مسلسل یہ تیرگیِ لحد — نہیں معلوم کتنی رات گئی

○

اب آنسو بھی تری تصویر کا آئینہ ہوتے ہیں — کبھی آنکھوں کو مشکل تھا ترا دیدار ہو جانا

○

زندگی ضبطِ مصائب ہے بقدرِ برداشت — موت ہے کثرتِ اندوہ سے گھبرا جانا
یوں تو یاد آتے ہی رہتے ہیں وہ اکثر لیکن — قہر ہوتا ہے کسی بات پہ یاد آ جانا

○

یا تو ابھی دُنیا نے خدا کو نہیں جانا — یا یہ ہے کہ دُنیا کا خدا کوئی نہیں ہے

○

اے بے کمال! تیرا زمانہ خلاف ہے — کس کس کی موت کا تجھے [illegible]

بسمل عجیب رنگ ہے اس بزمِ ناز کا
جو جائے گا وہاں وہ پشیمان آئے گا

○

وفا کر کے میں بھی پشیماں ہوا ہوں
جفا کر کے تو بھی پشیمان ہوگا
وہاں تک محبت نباہوں گا تم سے
جہاں تک محبت کا امکان ہوگا

○

چشمِ نظارہ طلب رہ گئی آخر تھک کر
نظر آتے ہی گئے وہ انہیں جتنا دیکھا
عشرتِ ہستیِ موہوم کہوں کیا بسمل
چشمِ بیدار نے اِک خوابِ تمنا دیکھا

○

جو ہوئی تھیں وجہِ ترکِ رسم و راہ
اُن جفاؤں کو بھی اب روتے ہیں ہم

○

کانٹے تو خشک ہو کے کھٹکتے ہیں اور بھی
وہ پھول تھے جو باغ میں مرجھا کے رہ گئے
معراجِ زندگیِ محبت کسے نصیب
اکثر تو اپنی جان سے بھی جا کے رہ گئے

○

محبت ساتھ: یہی ہے جہاں تک اپنے معنے کا
اب اُس سے ماورا کچھ میری حالت ہوتی جاتی ہے
محبت باوجودِ رشک توہینِ محبت ہے
مگر شاید محبت اب محبت ہوتی جاتی ہے
محبت اصطلاحِ عام ہو کر رہ گئی بسمل
زبانِ خاص کو اب اس سے نفرت ہوتی جاتی ہے

○

جس شخص کی بسمل سے ملاقات ہوئی ہے
وہ شخص محبت کے پیمبر سے ملا ہے

○

کلمہ گو گر کہیں پھرتے ہیں زباں سے اپنی
آج تک نام وہی وردِ زباں ہے کہ جو تھا

○

مری بالیں پہ مرگِ عشق یہ کہتی ہوئی آئی
مبارک عمرِ فانی کا حیاتِ جاوداں ہونا

○

ہائے وہ دن کہ روز مرتے تھے
آج لالے پڑے ہیں جینے کے

○

حرم سے دَیر کی جانب چلا ہوں اس توقع پر
کہ شاید کچھ مروّت ہو کسی پتھر کی آنکھوں میں

وہ ظلم کے انداز سے ممکن ہی نہیں تھا
جو ظلم بہ اندازِ کرم دیکھ رہا ہوں
اغیار کی آنکھوں کو میسّر نہیں بسملؔ
احباب کی نظروں میں جو رم دیکھ رہا ہوں

آشیاں ہے مرا اُس کنجِ چمن میں بسملؔ
کہ خزاں آتی ہے جس میں نہ بہار آتی ہے

عشرتِ دنیا مرا کیا ساتھ دیتی عمر بھر
یہ ترا غم تھا کہ جو وابستۂ جاں ہو گیا
بسملؔ اب اس منظرِ ہستی میں دلچسپی کہاں
دل پریشاں ہو گیا، عالم پریشاں ہو گیا

ہزار حسنِ عبادت گناہ سے پہلے
اور ایک لطفِ عبادت، مگر گناہ کے بعد
مرے نصیب کی برگشتگی بھی لیکن
پھرا ہے مجھ سے زمانہ تری نگاہ کے بعد

بسملؔ جلا کے شمعِ تمنّا تمام دن
بیٹھا ہوا ہوں رات اندھیری گزارنے

کفن بھی لاش کو جس کی نہ ہو سکا تھا نصیب
اب اس کی قبر پہ چادر چڑھائی جاتی ہے
تو وفات نے یوں زندگی گزروا دی
کہ جیسے آج تمنّا بر آئی جاتی ہے

ہے وہی اس کی منزلِ مقصود
جو جہاں تھک کے چور ہو جائے
کامیابی کی گر اُمید رہے
کامیابی ضرور ہو جائے
لذّتِ جستجو یہ کہتی ہے
منزلِ شوق دُور ہو جائے

یہ سُنا جاتا ہے بسملؔ کے لیے
اک ولی با مشرب [illegible]

اے چشمِ التفات تجھے جانتا ہوں میں
اب اس فریب میں کوئی [illegible]

آکے دنیا میں انقلاب کوئی ۔۔۔ دل کی دنیا بدل نہیں سکتا

○

کرم کی توقع تو کیا تم سے ہوگی ۔۔۔ ستم بھی کروگے تو احسان ہوگا

○

بے کسوں کا کون ہے پرسانِ حال ۔۔۔ کون پوچھے ہم سے کیوں روتے ہیں ہم
گر نہیں تو جان سے بڑھ کر عزیز ۔۔۔ جان کیوں تیرے لیے کھوتے ہیں ہم
بسملؔ اٹھ جائیں گے صبحِ حشر کو ۔۔۔ اب تو چادر تان کر سوتے ہیں ہم

○

نہ پوچھو زندگانی غفلتوں میں کھونے والوں کی
قفس میں آنکھ کھلتی ہے، چمن میں سونے والوں کی
ابھی اے عشقِ غارت گر نہ چھوڑ اس حال میں مجھ کو
ابھی تو ہنسنے والوں سے کمی ہے رونے والوں کی
برائی کرنے والوں کا برا انجام ہے بسملؔ
کنویں خس پوش ہیں راہوں میں کانٹے بونے والوں کی

○

تمہارے کارناموں کو زمیں کب تک چھپائے گی ۔۔۔ کہاں تک خاک ڈالو گے زمانے بھر کی آنکھوں میں
حرم سے دیر کی جانب چلا ہوں اس توقع پر ۔۔۔ کہ شاید کچھ مروت ہو کسی پتھر کی آنکھوں میں

○

کہاں ہیں اس بزمِ روز و شب میں وہ اپنی راتیں وہ دن ہمارے
اٹھائی شمعِ سحر تو اس کو بنا دیا آفتاب ہم نے
ہیں جتنی فلک میں بسملؔ خدا ہی جانے جو گردشیں ہوں
یہ کیا کہ اک جنبشِ نظر کو سمجھ لیا انقلاب ہم نے

○

کیا کام ہے زاہد کو عبادت کے سوا ۔۔۔ اور عبادت سے بھی کیا کام ہے عادت کے سوا
۔۔۔ ہی صورتیں ہوں گی ترے آئینے میں ۔۔۔ میرے آئینے میں کیا ہے تری صورت کے سوا

نظمیں

حورِ حرم

شریکِ راحت و غم اے مری شریکِ حیات
بہار ہے یہ جہاں نازشِ بہار ہے تو
یہ حسنِ سادہ یہ معصوم ادائیاں تیری
مذاقِ عشق و تقدیس ہے تری تسلیم
ہمیشہ فرض ادائے نیاز ہے تجھ پر
سما گئی ہے کچھ اس طرح میری ہستی میں
بغیر میرے تجھے تو بھی خود عزیز نہیں
مری نگاہ سے وابستہ ہے نگاہ تری
مجھی سے تجھ کو محبت مجھی سے شکوہ ہے
ہمیشہ میری ہی چتون کو دیکھتے رہنا
مرے ہی واسطے خود بین و خود نما ہونا
لحاظ دل شکنی دل دہی کا رکھتی ہے

مری حیات کے مقصد کی جان ہے تری ذات
کہ حسنِ صنعتِ خالق کی شاہکار ہے تو
نہاں ہیں تجھ سے بھی خود دلربائیاں تیری
ادا ادا تری کوثر نگہ نگہ تسنیم
اگرچہ حسن و محبت کو ناز ہے تجھ پر
کہ اپنے آپ کو رکھا نہ اپنی ہستی میں
کہ جیسے میرے بغیر آپ کوئی چیز نہیں
مجھی سے واہ تری اور مجھی سے آہ تری
مجھی سے دین ہے تیرا مجھی سے دنیا ہے
مری نظر کی اجازت کے بعد کچھ کہنا
مجھی کو صرف میسر ہے آئنہ ہونا
خیال میری خوشی ناخوشی کا رکھتی ہے

اگرچہ پاسِ خوشی بھی نہیں ہے کم تجھ کو
مگر خوشی سے سوا ہے لحاظِ غم تجھ کو

تو ناخوشی میں بھی رہتی ہے میری خاطر خوش
ہزار غم بھی ہوں دل پر مگر بظاہر خوش

شریک دل سے مری حالتِ تباہ میں ہے
نگاہ میں ہے تبسّم، ترنّم آہ میں ہے

جو کوئی بات گراں بھی تجھے گزرتی ہے
تو کس خوشی سے طبیعت پہ جبر کرتی ہے

تڑپ کے سینے سے کیوں دل نکل نہیں آتا
کہ دم پہ بن کے بھی تیوری پہ بل نہیں آتا

یہ تیری محنتِ پیہم یہ تیری صبح و شام
مرا خیال ہے، بچوں کی فکر گھر کا کام

ترے نصیب کے دن ہیں کچھ ایسے دنیا میں
خوشی نہ ہو تری قسمت کی جیسے دنیا میں

یہ سرد آہ تری جس سے تو سلگتی ہے
اس آہ کی دلِ قدرت پہ چوٹ لگتی ہے

صد آفریں تجھے یہ تیری فطرتِ عالی
زہے یہ ظرف زہے تیری ہمتِ عالی

تو بے نیاز ہے ہر چند بے نیاز نہیں
ترا نیاز کسی کا بھی رہنِ ناز نہیں

یہ کہہ رہی ہیں اگرچہ ڈگر ڈگر آنکھیں
کسی کے سامنے جھکتی نہیں مگر آنکھیں

خیال بھی تو کسی کا نہیں ترے دل میں
نہیں ہے تیرے سوا جیسے کوئی محفل میں

اگرچہ سلکِ گہر بھی ہو کوئی نخوت خو
مجال کیا کہ اسے آنکھ اٹھا کے دیکھے تو

مقابلہ نہیں کرتی تو اپنی حالت سے
غرض نہیں تجھے اہلِ جہاں کی ثروت سے

ہزار غم سے نفس ہے سرد و نرم رواں
تری رگوں میں ہے غیرت کا خونِ گرم رواں

یہ کہہ رہا ہے ترا اشکِ دیدۂ غمناک
کہ تاجِ شاہی کے موتی کی آبرو پہ خاک

ہلائے دیتے ہیں تاروں کو آسمانوں کے
یہ چار پیسے کے آویزے تیرے کانوں کے

نئے نشاط ترے ساغرِ سفال میں ہے
خوش اپنے حال میں ناخوش بھی اپنے حال میں ہے

کرے نہ کیوں تری ہستی پہ حسنِ فطرت ناز
کہ بے نیازِ تکلف ہے تیرا ہر انداز

یہ سادگی کو ترے حسن کی ہے اندازہ
کہ حسن کا ہے فقط سادگی ہی اک غازہ

مٹے نہ فطرتِ بے لوث کے تری جوہر
اثر نہیں کوئی تیرے ضمیر و باطن پر

تو اور قدیم روایات اور وفاداری
جدید علم نہ تہذیبِ نو کی عیاری

جہاں میں جس سے ہے رنگیں مزاجِ نسواں
وہ لاکھ علم ترے جہلِ سادہ پر قرباں

ہزار جہل سے بدتر ہے چاک دامانی
ہزار علم سے بہتر ہے پاک دامانی

بنائیں جن کو سلیقہ شعار یاں پُرفن
مبارک ان کے سلیقوں سے تیرا الھڑپن

اُٹھے حجابِ فریب اب جو دیدہ و دل سے
حقیقتوں کا ہوا انکشاف — باطل سے

خجل بھی خوش بھی ہوں تجھ سے یہ بات کہہ کر میں
سمجھ سکا ہوں تجھے تجھ سے دور رہ کر میں

خرابیوں کو بھی میری بنا دینے والی
بُرائیوں کو بھی میری سراہنے والی

مرے چلن مجھے پہنچائیں جس مصیبت پر
اُسے بھی کرتی ہے محمول اپنی قسمت پر

گزر گئے ہیں مگر دل پہ داغ ہیں اب تک
وہ دن جو لعنتِ قلب و دماغ ہیں اب تک

کہاں ہے میری ہوس کاریوں کا وہ عالم
نظر ہوئی جو ترے حُسنِ سادہ سے برہم

پھرا نظر میں طلسمِ خیالِ زنگار رنگ
ہوا اسیرِ فریبِ جمالِ زنگار رنگ

فتورِ عقل کو میں جب شعور سمجھا تھا
ہر ایک لعبتِ لعنت کو حور سمجھا تھا

تری وفاؤں کے سجدوں سے ہو کے میں بیزار
ہوس کی ٹھوکریں کھاتا پھرا اسیرِ بازار

نہ آئی لینے تری یاد بھی جہاں مجھ کو
دلِ خراب نے پہنچا دیا کہاں مجھ کو

دلِ خراب تھا عصیاں گہِ جوانی تھی
مرا شباب تھا، قرباں گہِ جوانی تھی

مگر ہنوز ترا حاصلِ دعا میں تھا
خدا کے سامنے سجدوں کا مدعا میں تھا

دُعائیں تو بہ درِ لاشریک مانگتی تھی
خدا سے میری محبت کی بھیک مانگتی تھی

اِن آنسوؤں کی دعاؤں کا تیری ہے یہ اثر
وہی ہوں میں، وہی تو ہے، وہی ہمارا گھر

اگرچہ آئینۂ خوب و زشت ہے دُنیا
مگر ہمارے لیے اب بہشت ہے دُنیا

ملالِ رشک نہ اندیشۂ جدائی ہے
ہم اب وہاں ہیں جہاں عشق کی خدائی ہے

مصیبتوں میں ہے راحت ہماری جنت میں
ہر ایک غم ہے مسرت ہماری جنت میں

اُجاڑنے سے یہ جنت کہیں اُجڑتی ہے
مصیبتوں سے محبت میں جان پڑتی ہے

سیاہ ساڑی

مصروفِ سیرِ شام لبِ بام ہے کوئی
یا صبحِ حسن شام بر اندام ہے کوئی

خود جلوۂ صبیح ہے ساڑی سیاہ ہے
پتلی میں جیسے آنکھ کی نورِ نگاہ ہے

فانوسِ شب میں جیسے ہو شمعِ خیالِ دوست
جیسے شبِ فراق میں یادِ جمالِ دوست

ابرِ سیاہ رنگ میں بجلی کی سی چمک
فردِ سیاہ کار میں رحمت کی اک جھلک

پرتو گھٹا کا غنچۂ نورس لیے ہوئے
شامِ اودھ ہے صبحِ بنارس لیے ہوئے

اِک آفتاب کالی گھٹا کے ہے دوش پر
دیوی ہے شام کی کہ خداوندۂ سحر

قسمت چمک اٹھی ہے لباسِ سیاہ کی
روشن کسی کی رات ہو جیسے گناہ کی

رخِ پر اڑائے جاتی ہے آنچل کو یوں ہوا
جس طرح چاند پر سے ہو بادل گزر رہا

اے پیکرِ صبیح ! لباسِ سیاہ میں
کافر تجھی سے آئی ہے لذت گناہ میں

ہے عشقِ سادہ حسن سے مجبورِ معصیت
شاید بنا تجھی سے ہے دستورِ معصیت

پیدا تجھی سے دل میں ہے امکانِ آرزو
نظارۂ جمال ہے اعلانِ آرزو

اے کعبۂ نگاہِ تمنا سلامِ شوق
پہنچا رہی ہیں تجھ کو نگاہیں پیامِ شوق

کشمکش

عدو کے ساتھ وہ بیٹھے ہوئے ہیں میرے پاس
بچی بچی سی نگاہیں رُکے رُکے انفاس

رہیں کشمکشِ عاشقی و بوالہوسی
تعلقاتِ قدیم و جدید کا احساس

زہے تراوشِ جذباتِ مختلف یعنی
اُدھر نگاہِ محبت اِدھر نگاہِ یاس

زہے کرشمۂ زہے اعتبارِ عشق و ہوس
نگاہِ حسن بھی ہوتی ہے کیا مزاج شناس

ادا ادا کو ملا ہے احساس ذمہ داری کا
اُدھر وثوق رہے اور اِدھر نہ ٹوٹے آس

یہ مشکلات یہ مجبوریاں ارے توبہ
نظر سے اور کچھ اظہارِ دل میں کچھ احساس

کبھی ترنمِ گلبانگ اور کبھی دمِ سرد
کبھی شگفتہ شگفتہ کبھی اُداس اُداس

عجیب کشمکش و گومگو کا عالم ہے
کچھ اُس کا پاس اُدھر ہے اِدھر ہے میرا پاس

صدا اعتراف و صدا اظہارِ شوق کی ضامن
کبھی کبھی غلط انداز اِدھر نگاہِ یاس

اداشناس یہی حسن کا ہے کچھ ہر چند
ملی ہے عشق کو شوریدگی بجائے حواس

ہر ایک بات نئے انشائے راز ہے لیکن
خدا کا شکر کہ ہوتی نہیں ہوس حساس

مزاجِ حسن خلافِ وفا نہیں بیشک
مگر وفائے ہوس جب نہ آئے حسن کو راس

عرضِ بیداری

جاگ، او خانہ براندازِ چمن، خواب سے جاگ!
جاگ، او جانِ چمن، نازِ چمن، خواب سے جاگ!
جاگ، او دولتِ دیدارِ چمن، خواب سے جاگ!
جاگ، او قسمتِ بیدارِ چمن، خواب سے جاگ!
جاگ، او صبحِ نخستینِ چمن، خواب سے جاگ!
جاگ، او نزہتِ سیمینِ چمن، خواب سے جاگ!

مسکراتے ہوئے بیدار ہو اے جانِ بہار
تیری بیداری ہی گلشن میں ہے اعلانِ بہار
کھول کر آنکھ ذرا کھینچ دے تصویرِ بہار
جنبشِ موجِ نظر ہے تری تقدیرِ بہار
ہاں ذرا عارضِ گلگوں کا اثر ہونے دے
رنگ آمیزِ گل و برگ و ثمر ہونے دے

بے کسل کیف ہے اندازِ طرح داری میں
نیند سوئی ہوئی ہے حسن کی بیداری میں
تجھے بیدار صبا کرتی ہے کن چالوں سے
گدگدی گالوں پہ کرتی ہے ترے بالوں سے
جاگ اور جاگ کے آثارِ سحر پھیلا دے
رخِ روشن سے اب انوارِ سحر پھیلا دے

چاند اور چاندنی دونوں کو اجازت دے دے
رات بھر جاگے ہوئے تاروں کو رخصت دے دے
پھول بیتاب ہیں گلشن میں مہکنے کے لیے
منتظر بیٹھی ہیں چڑیاں بھی چہکنے کے لیے
اٹھ مسہری سے قدم رنجہ زمیں پر فرما
اوجِ تقدیرِ زمیں چرخِ بریں پر فرما

سبزے کی حسرتِ پابوس نکل جانے دے
اپنے قدموں سے ذرا اس کو مسل جانے دے
اٹھ کے تبلا دے کہ ہے سرو کو کس بات پہ ناز
چل کے دکھلا دے نسیمِ سحری کے انداز
پائے رنگیں کے عطا کر لبِ جو کو بوسے
جگمگا حوض کے آئینے کو عکسِ رخ سے

حوض میں عکسِ تبسم کا اثر پیدا کر
مچھلیوں کے لیے پانی میں گہر پیدا کر
دیکھ اک منتظرِ دید کی امید کو دیکھ
اپنا دیدار دکھا، مضطربِ دید کو دیکھ
کروٹیں لے کے نہ ہلچل مرے جذبات میں ڈال
دلِ معصوم کو للہ نہ آفات میں ڈال

تھی نسیمِ سحری کیا تری انگڑائی میں
جاگ اٹھی لہر سی اک باغ کی انگنائی میں
اے وہ خاموش فضاؤں میں تلاطم آیا
اے وہ انگڑائیاں آئیں، وہ تبسم آیا
تو جو اے غنچہ دہن ناز سے ہنس کر جاگی
ہر کلی بن کے گلستاں کا مقدر جاگی

رباعیاں

مرشد نے دعا جو بہرِ سائل فرمائی
نخوت وہ دعا میں اپنی شامل فرمائی
اللہ نے جبریل سے گھبرا کے کہا
دیکھو تو یہ وحی کس نے نازل فرمائی

○

خلوت میں مرا مشغلہ مے نوشی کا
اسلام کے نقصان کا باعث ہے سوا
یا وقتِ جماعت سیرِ بازار اکثر
مسجد کے قریب آپ کا بیٹھا رہنا

○

بوسیدگی کپڑوں کی نہ کرتی تھی حزیں
فاقوں میں بھی خوش رہتے تھے شاہنشہِ دیں
ان باتوں کو اب وعظ میں کرتی ہے بیاں
اُبھری ہوئی توند اور عبائے زرّیں

○

وہ اور ہے وہ گھر پہ لگانے کی ہے
یہ اور ہے یہ وعظ میں لانے کی ہے
دو عینکیں رکھتے ہیں جناب واعظ
اک دیکھنے کی ایک دکھانے کی ہے

○

مستغنیِ احکامِ شریعت ہو لوں
وابستۂ اوہامِ طریقت ہو لوں
چھوٹیں گے نہ اب حضرتِ مرشد کے قدم
بہتر ہے کہ اللہ سے رخصت ہو لوں

○

بربادیِ اسلام الٰہی توبہ
اُس صبح کی یہ شام الٰہی توبہ
قرآں سے آغاز ہو قوّالی کا
قرآں کا انجام الٰہی توبہ

○

رُوداد جوانی کی مکمل نہ ہوئی
مجمل ہی رہی بات مفصل نہ ہوئی
کل کے لیے رکھتا ہے جوانی بسمل
ناعاقبت اندیش اگر کل نہ ہوئی

ہر چیز جنھیں حسبِ تمنا دی تھی
ہر چیز جنھیں اُن کی ہی سمجھا دی تھی
جنت کے کھلونوں سے جہنم بھر جائے
یہ بھی انھیں دے دے جنھیں دنیا دی تھی

○

آثارِ حیات سے بھی مرجاتا ہوں
سچ جانیے میں جی سے گزر جاتا ہوں
اتنی کڑکی ہے غم کی بجلی دل پر
آواز سے قہقہے کی ڈر جاتا ہوں

○

شیطان سے مانگتا ہے انسان پناہ
انسان سے شیطان کے دل میں اکراہ
اِک دوسرے کو دیکھتے ہی کہتے ہیں
لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ

○

مستِ مئے پندار کسل سے ہشیار
پاداشِ عمل، ردِ عمل سے ہشیار
اوروں کی طرف پھینکنے والے پتھر
اپنے بھی ذرا شیش محل سے ہشیار

○

یہ امن و اماں کی رہگذر ہے بسمل
وہ رہ گزرِ خوف و خطر ہے بسمل
تم ایک دوراہے پہ کھڑے ہو اس وقت
دُنیا ہے اِدھر، دین اُدھر ہے بسمل

○

جس شب میں نشاط و عیش شانے تھپکیں
جس شب میں نظاروں کی نہ پلکیں جھپکیں
وہ شب جو تمام قہقہوں میں گزرے
اُس شب کو نچوڑ دو تو آنسو ٹپکیں

○

تہذیب اُسے ناگوار مذہب اُسے شاق
کچھ ذوق شعوری نہ تمیزی ہے مذاق
کج خلقی و بدروئی یہ دانستہ نہیں
دولت کا مزاج ہے خلافِ اخلاق

○

ملتے ہی بنا لیتے ہیں صورتِ محسن
رکھتے ہیں نہ صاحب نہ سلامت محسن
بدتر ہے وہ احسان فراموشی سے
لیتے ہیں جو احسان کی قیمت محسن

◄ نذرانۂ خلوص ►

تری نظر نے لنڈھائے ایاغ کیا کیا کچھ ‏ ‏ ترے نفس نے جلائے چراغ کیا کیا کچھ
بساطِ شعر یہ دو چار گل کی بات نہیں ‏ ‏ کھلے ہوئے ہیں ہر اک سمت باغ کیا کیا کچھ

—— محسن زیدی

- —— کرشن موہن —— شاعرِ کامل
- —— کمار پاشی —— اسے زندہ نہیں دیکھا
- —— بانی —— عقیدت کا ایک پھول
- —— ضیا فتح آبادی —— بسملِ غزل
- —— سید فضل المتین —— ایک تاثر
- —— رشی پٹیالوی —— استادِ فن
- —— مراد سعیدی —— آپ کے بزمِ سخن میں ہے چراغاں بسمل
- —— حیات جاوید —— پیکرِ وفا

شاعرِ کامل

کرشن موہن

شاعرِ کامل، پختہ گو، اُستادِ فن
جس کے شعروں سے ہے عیاں اُردو کی پھبن
جس کا تن من روز و شب ہے نذرِ سخن
جس کے شرمیلے پن میں بھی اپنا پن
جلوہ افگن، پاکیزہ اور من موہن
اس کی غزلیں مہر و محبت کے درپن
وحدت کی آئینہ دار ہے اُس کی زباں
فرق مٹانا، پیار نبھانا اُس کا چلن
فکر و نظر سے، احساساتِ رنگیں سے
جیت چُکا ہے وہ اہلِ اُردو کا من
اُس کا جنوں پربت پربت صحرا صحرا
اس کی خرد وادی وادی گلشن گلشن
اُس نے کیا ہے ملک میں روشن ٹونک کا نام
اس کے شعروں سے کھِل اُٹھا ہے یہ چمن
جس کے دم سے کتنے شناور پار ہوئے
تیغِ ادا کا بسمل ہے وہ خستہ تن
کتنے شاعر اور ہیں جن میں ملتی ہے
اتنی قدرت، اتنی صلابت، اتنی لگن
کرشنا موہن نے اُس سے بھی سیکھی ہے
باریکی و رمزِ فن، تکنیکِ سخن

اُسے زندہ نہیں دیکھا

کمار پاشی

اُسے زندہ نہیں دیکھا گیا ہے ایک مدّت سے
اُسے ڈھونڈھو
وہ اپنے ذہن کی تاریک دلدل میں
کہیں لت پت پڑا ہوگا

مجھے معلوم ہے یہ شہر اک شہرِ خموشاں ہے
مگر زندہ ہے سایوں میں یہاں بیمار آبادی
اسی گنجان آبادی کے اک گوشے میں، اس نے بھی
کبھی پایا تھا سب سے مختلف خود کو
اسے کب موت آئی، کب جلا وہ گھر کے کونے میں
کوئی تو جانتا ہوگا
کوئی تو جانتا ہوگا کہ وہ آبادیوں کے شور سے کیوں بچ کے چلتا ہے
اسے کس نے سلگنے کی سزا دی ہے

کہاں ہے شہر اس کا جس نے دیکھا تھا اسے آوارگی کرتے
سرِ شب مے کشی کرتے
کہاں ہے شہر اس کا، جس نے دیکھا تھا اسے بزمِ طرب میں گفتگو کرتے
کسی کی آرزو کرتے

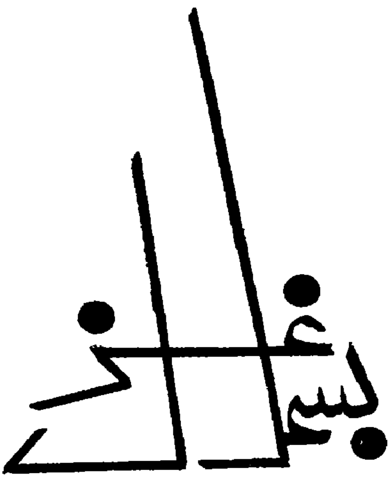
مجھے معلوم ہے خود کو میں جب زندہ کبھی محسوس کرتا ہوں
تو وہ ماضی کے پس منظر میں آتا ہے نظر مجھ کو
مجھے اپنا سمجھ کر پوچھتا ہے: تم نے دیکھا ہے وہ شہرِ گمشدہ میرا؟
مجھے معلوم ہے وہ شہر اس کے ذہن کی تاریک دلدل میں
کہیں لت پت پڑا ہوگا
اُسے ڈھونڈھو
اُسے زندہ نہیں دیکھا کسی نے ایک مدّت سے

باقی

عقیدت کا ایک پھول

آج ... اک عُمر ہوئی !
جانے کیا گُم شُدہ لمحہ تھا ——— تری ذات سے منسوب ہُوا
اور جس نے تجھے
... بے رشتگیِ وقت کی تصویر بنانا چاہا ...
جانے کیا گُم شدہ جھونکا تھا ——— ترے شوق میں ڈھونڈا کیا پہچان اپنی
اور جس نے تجھے
... ویران مقاموں کا سفر سونپ دیا ...
آج ... اک عُمر ہوئی
غم تری آنکھ میں ہے ——— غم تری آواز میں ہے
ایک سُر کتنا جُدا ——— ساز میں ہے
ایک موسم ... ترے سینے کا دُھواں
ایک شعلے کے سوا ...
اب کوئی منظر نہیں اتنا ارزاں
اک مہک تیرے لہو کی ———
تو ہی بسمل اُس کا
اک فضا تیرے قریب اور بھی تھی ———
تو ہی قاتل اُس کا ! !

ضیا فتح آبادی



کل شام ناگہاں سر رہ مل گئی مجھے
فتنے قدم قدم پہ جگاتی ہوئی غزل
پوچھا کہ آج پائے سفر کا ہے رُخ کدھر
بولی نظر جھکا کے لجاتی ہوئی غزل

کہتی ہوں دل کی بات جو پھیلی ہے شہر میں
پردہ ہی اٹھ گیا ہے تو تجھ سے چھپاؤں کیا
محبوبہ جس کی ہوں، مرا محبوب ہے وہی
سودا ہے کس دیار کا سر میں بتاؤں کیا

گرمی ہے بزم شعر میں جس کی نواؤں سے
میرے خدنگِ ناز کا بسمل وہی تو ہے
سرگرداں کو بہ کو ہوں میں جس کی تلاش میں
دلبر مرا وہی، مری منزل وہی تو ہے

ایک تاثر

حضرت بسمل سعیدی کو دیکھ کر

سید فضل المتین

بجھی ہوئی مضمحل یہ آنکھیں!
تلاش کرتی ہیں ——— روز و شب کے گذشتہ ہنگامہ ہائے عشرت
کشادہ روشن جبیں کی ہر اک فسردہ سلوٹ میں رینگتے ہیں ——— ہزار سائے
شراب کی محفلوں کے سائے
شباب کی منزلوں کے سائے

خموش ہونٹوں پہ رقص کرتی ہیں ——— زندگی کی حسین رنگین داستانیں
وہ داستانیں!
غمِ زمانہ، غمِ محبت ہیں جن کے عنواں!!
ملول چہرے کی ہر علامت! نمایاں کرتی ہے عہدِ رفتہ کا ہر وہ نقشِ جمیل و رعنا
امین ہے جو حیات افروز لذتوں کا
امید پرور لطافتوں کا
خلوص پرور روایتوں کا
قدیم امنٹ صداقتوں کا
دراز قد گو تمازتِ درد و غم کے باعث جھلس چکا ہے
بظاہر اب جو کہ تھک چکا ہے

. . . .

گذشتہ شام و سحر کا بارِ گراں اٹھائے
سنبھل سنبھل کر قدم بڑھائے
الجھ رہا ہے
نئے تقاضوں کی روشنی سے
حیاتِ نو کی ستم گری سے!

رشی پٹیالوی

استادِ فن

صہبائے سخن کے ہیں وہ پیرِ مغاں بسمل
میخانہ لُٹائیں گے جائیں گے جہاں بسمل
نغمات کے پردوں میں بول اٹھتی ہے خاموشی
جذباتِ محبت کو دیتے ہیں زباں بسمل
ہر ذہن کو گرما دے ہر قلب کو تڑپا دے
اشعار میں بھرتے ہیں وہ سوزِ نہاں بسمل
ہر جادۂ علم و فن گرد اُن کے تعاقب میں
لیتی ہے قدم منزل ہوتے ہیں رواں بسمل
برسے گی وہاں داد و تحسین فضاؤں سے
محفل میں جہاں ہوں گے سرگرمِ بیاں بسمل
لیتے ہیں قدم بڑھ کر "فنی" بھی "عروضی" بھی
استادوں کی صف میں ہیں استادِ زماں بسمل

قسمت سے رشی پایا الطافِ قدم بوسی
یہ عزت و شرف سب کو دیتے ہیں کہاں بسمل

آپ ہیں بزمِ سخن میں چراغاں بسمل

مراد سعیدی

آپ ہیں اگلی شرافت کے نگہباں بسمل
ہیں روایاتِ قدیم آپ پہ نازاں بسمل

باغبانِ ادب و علم تھے سیماب و سعید
آپ ہیں اُن کی بہاروں کے گلستاں بسمل

آپ کے شعر ہیں یا شمعِ شبستانِ غزل
آپ سے بزمِ سخن میں ہے چراغاں بسمل

زندگی فکر میں اتنی ہے کہ شاید ہو جائے
صبحِ شامِ ابد مطلعِ دیواں بسمل

آپ کے شعر میں محسوس نظر ہوتی ہے
شامِ میخانہ و صبحِ چمنستاں بسمل

جس کے پروانے ہیں الہام کے ماہ و انجم
آپ کی فکر ہے وہ شمعِ فروزاں بسمل

آفریں باد، ہائیں نازکیِ طبع و مزاج
آپ حالات سے ہیں دست و گریباں بسمل

آفریں باد، بریں فکرِ صحیح و صائب
با دلِ مضطرب و ذہنِ پریشاں بسمل

زندگی آپ سے خود پوچھتی ہوگی شاید
کیا بجز موت نہیں درد کا درماں بسمل

آپ کے واسطے اک حادثہ بن کر افسوس
ہو گئی صبحِ وطن شامِ غریباں بسمل

یوں تو لکھنے کو بہت میں نے لکھے ہیں اشعار
ایک بھی شعر نہیں آپ کے شایاں بسمل

کیا یہ کچھ کم ہے شرف شعر و شرافت کے لیے
ہے مراد آپ کا وابستۂ داماں بسمل

حیاتِ جاوید

پیکرِ وفا

جنابِ بسمل سعیدی ٹونکی وہ گھر سے تشریف لا رہے ہیں
نثار لاکھوں لطافتیں ہوں قدم کچھ ایسے اُٹھا رہے ہیں

نظر نظر پیکرِ وفا کی پیامِ الفت سُنا رہی ہے
خلوصِ دل کا عجب اثر ہے کہ آپ ہی مُسکرا رہے ہیں

گدازِ پنہاں کا در کھُلے گا اگر وہ مصروفِ گفتگو ہوں
سکوتِ لب پر بھی ہم نے دیکھا دلوں کو جیسے جگا رہے ہیں

یہ صرف تصویرِ غم نہیں ہیں غموں کو پالا ہے خون دے کر
جبینِ غم فخر سے ہے اونچی کچھ اس طرح غم اُٹھا رہے ہیں

خوشی سے دامانِ دل ہے خالی اگرچہ شامل ہیں انجمن میں
بہ پاسِ احباب سچ تو یہ ہے کہ ہنس رہے ہیں ہنسا رہے ہیں

○

ارمغانِ خیال

یقیں نہ آئے کسی اور کی طرف سے مجھے
اگر سنائے کوئی مجھ کو داستاں میری

- دل ایوبی
- مخمور سعیدی
- کمار پاشی
- احمد حسین خان راہی
- اعجاز اعظمی
- قوی ٹونکی

دلؔ ایوبی

سراپا درد بن کر، ایک دردِ لادوا ہو کر
مجسّم دید بن کر، آئینہ در آئینہ ہو کر
فدائے جلوہ سامانیِ محبوبِ خدا ہو کر
کوئی دیکھے غمِ عشقِ محمدؐ میں فنا ہو کر
اجل ہنستی ہوئی آتی ہے پیغامِ بقا ہو کر،

غلامانِ شفیعِ عاصیاں ہیں جو مقدّر سے
وہ ہوں گے غم زدہ کیوں پرسشِ اعمال کے ڈر سے
نہ گھبرائیں گے قہرِ آفتابِ روزِ محشر سے
گرے ہیں جو غمِ امّت میں مژگانِ مطہّر سے
وہ آنسو حشر میں برسیں گے رحمت کی گھٹا ہو کر،

نظر ہو تو وہ حُسن و عشق کی دنیا کوئی دیکھے
فروغِ حُسنِ وحدت جلوہ در جلوہ کوئی دیکھے
حدِ رازِ و نیازِ بندہ و مولا کوئی دیکھے
مدینے کی زمیں لذّتِ سجدہ کوئی دیکھے
کہ فرض اک سجدہ کر دیتا ہے ہر سجدہ ادا ہو کر،

مبادا وجہِ کلفت ہو کوئی ذہنِ مقدّس کو
مکّہ رما سوا کر دے کبھی ذہنِ مقدّس کو
نہ ہو محسوس خلوت کی کمی ذہنِ مقدّس کو
ضرورت دیکھ کر یکسوئی کی ذہنِ مقدّس کو
اتر آیا زمیں پر لامکاں غارِ حرا ہو کر،

مدینہ رشکِ خلد و غیرتِ فردوس ہے اے دلؔ
بہاریں کیوں نہ آئیں بن کے رنگ و نور کی سائل
خدا شاہد مدینے ہی کو ہے یہ مرتبہ حاصل
حصولِ تازگی کے واسطے ہر صبح کو بسمل
ہوائے خلد آتی ہے مدینے میں صبا ہو کر،

مخمور سعیدی

جو ہو، فسکرِ مآلِ کار سے غافل، نہیں ملتا
کسی سر میں جنونِ سعیِ لاحاصل نہیں ملتا
ہوئے وہ ہمسفر جن سے مزاجِ دل نہیں ملتا
و مری بے رہروی کو رہبرِ کامل نہیں ملتا
کوئی مستغنیِ رسم و رہِ منزل نہیں ملتا؛

سفینے کی حفاظت کا یہاں کوئی نہیں ضامن
شکست انجام ہو جائے گا عزمِ ناخدا اک دن
کنارے جا لگے بیڑا امیدوں کا، یہ ناممکن
و سفینہ بھی ہے بحرِ عشق میں ساحل بھی ہے لیکن
سفینہ جس کو ملتا ہے اُسے ساحل نہیں ملتا،

نیازِ عشق کا وجہِ نشاطِ زندگی ہونا
حریمِ ناز سے نسبت کی دل کو آگہی ہونا
کہ سر سجدے میں اور سر میں شعورِ بندگی ہونا
و ترے در پر زہے شرمندۂ دریوزگی ہونا
دو عالم میں دماغِ نخوتِ سائل نہیں ملتا،

بہارِ لالہ و گُل سے فروغِ کہکشاں تک ہے
یہی نظارۂ رنگیں زمیں سے آسماں تک ہے
یہی جلوے نظر میں ہیں نظر کی حد جہاں تک ہے
و خدا جانے تری محفل کا عالم بھی کہاں تک ہے
کوئی دنیا میں دُور افتادۂ محفل نہیں ملتا،

رہا امکاں نہ چاکِ دامنِ احساس سِلنے کا
بھروسہ کیا گُلِ جذباتِ پژمردہ کے کھِلنے کا
نہیں اپنی جگہ سے غالباً پتھر یہ ہلنے کا
و عبث احباب کو شکوہ ہے بسمل دل نہ ملنے کا
ملے گا کیا کسی سے، اب ہمیں سے دل نہیں ملتا،

کمار پاشی

جس طرف لے جائے یہ دل، اُس طرف جاتا ہوں میں
یوں کبھی خود سے، کبھی دنیا سے ٹکراتا ہوں میں
بے خودی میں جانے خود کو کیا نظر آتا ہوں میں
’ہر بلند و پست کو اس طرح ٹھکراتا ہوں میں
کوئی یہ سمجھے کہ جیسے ٹھوکریں کھاتا ہوں میں‘

دور تک پرچھائیاں ہیں، دیکھتا ہوں میں جدھر
آئینے کے روبرو بھی کچھ نہیں آتا نظر
اپنے ہونے اور نہ ہونے کا چمک اُٹھتا ہے ڈر
’ایک سناٹا سا چھا جاتا ہے قلب و روح پر
ہائے وہ عالم، مجھے جب یاد آ جاتا ہوں میں‘

ایک ویرانہ ہے پوشیدہ چمن آرائی میں
گم ہوئی جاتی ہے دنیا درد کی شہنائی میں
کس کی چیخیں گونجتی ہیں آج یہ پروائی میں
’فکرِ انجامِ محبت، عالمِ تنہائی میں
جیسے اپنے آپ میں ڈوبا چلا جاتا ہوں میں‘

دیکھ وہ، ڈھلنے لگی ہیں شام کی پرچھائیاں
دور بجتی ہیں کسی کی چاپ کی شہنائیاں
آ رہا ہے کوئی سچ مچ بھول کر رسوائیاں
’کون جانے، یا میں جانوں یا مری تنہائیاں
جانے کیا کہہ کر دلِ مضطر کو سمجھاتا ہوں میں‘

دور ہے مجھ سے بہت اب میری منزل کیا کروں
کھو گئے ہیں زیست کے ہنگامے سے ساحل کیا کروں
کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا ہے اے دل! کیا کروں
’موت سے بچ کر کدھر جاؤں میں بسمل! کیا کروں
ہر طرف سے کوئے قاتل میں پہنچ جاتا ہوں میں‘

کھلا پانی

دل کو ماضی کی کوئی یاد دلانا بھی نہیں
کوئی اِس ترکِ تعلّق کا ٹھکانا بھی نہیں
کوئی پوچھے کہ ہوا کیا تو بتانا بھی نہیں
آپ جانا بھی نہیں ان کو بلانا بھی نہیں
مگر اس طرح کچھ آسان بھلانا بھی نہیں

جو گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھی چل دیتے تھے
سنگِ ہر راہ کو پیروں سے کچل دیتے تھے
دستِ شب میں جو اجالوں کا کنول دیتے تھے
جو فسانوں کو حقیقت میں بدل دیتے تھے
آج دنیا میں کہیں اُن کا فسانا بھی نہیں

اب تو اک رسم نبھانے کے لیے آتے ہو
پیاس آنکھوں کی بڑھانے کے لیے آتے ہو
آگ سی دل میں لگانے کے لیے آتے ہو
تم جب آتے ہو تو جانے کے لیے آتے ہو
اب جو آ کر تمھیں جانا ہو تو آنا بھی نہیں

تو نے کیا کیا نہ ستایا ہے زمانے مجھ کو
آگ میں غم کی جلایا ہے زمانے مجھ کو
کیا سے کیا تو نے بنایا ہے زمانے مجھ کو
جس قدر تو نے رلایا ہے زمانے مجھ کو
اب کسی اور کو اتنا تو ہنسانا بھی نہیں

اب تو اک پل بھی میسّر نہیں راحت بسمل
اب کسی شے کی نہیں دل کو ضرورت بسمل
خود سے بھی دُور نکل جاؤں ہے حسرت بسمل
کنجِ تربت کا تصوّر ہے غنیمت بسمل
ورنہ دل میں کوئی اور ٹھکانہ بھی نہیں

محمد حسین خاں راہی

بیزارِ جانِ زار ہیں قلبِ حزیں سے ہم
رکھیں گے کیا امید کوئی اب کہیں سے ہم
گھبرا چکے ہیں عالمِ اندوہ گیں سے ہم
کب سے اُلجھ رہے ہیں دمِ واپسیں سے ہم
دو اشک پونچھنے کو تری آستیں سے ہم

نکھری ہوئی ہے آج بھی یادوں کی وہ شفق
کب عشق کو تھا عہدِ فراموشیوں کا حق
ازبر ہے دل کو اب بھی محبت کا ہر سبق
ہوگا تمھارا نام ہی عنوانِ ہر ورق
اوراقِ زندگی کو اُلٹ دیں کہیں سے ہم

ناقدریِ سجود گوارا کہیں نہیں
کیا بندگیِ غیر کا باعث تمھیں نہیں
ہم اور سر جھکائیں کہیں پر نہیں نہیں
سنگِ درِ عدو پہ ہماری جبیں نہیں
سجدے یہ کر رہے ہیں تمھاری جبیں سے ہم

بدلے ہوئے ہیں آج زمان و مکانِ عشق
خاموشیوں میں کھو گئی آہ و فغانِ عشق
اب وہ زبانِ شوق نہ اب وہ بیانِ عشق
دہرائی جا سکے گی نہ اب داستانِ عشق
کچھ وہ کہیں سے بھول گئے ہیں کہیں سے ہم

دنیائے رنگ و بو میں ہیں مستِ شرابِ شوق
اوجھل نظر سے ہو نہیں سکتی کتابِ شوق
اپنے عروج پر ہے ابھی آفتابِ شوق
بسمل حریمِ حسن میں ہیں کامیابِ شوق
جوشِ شباب و رنگِ رخِ آتشیں سے ہم

اعجاز اعظمی

مانوس کس قدر ہیں رُخِ دل نشیں سے ہم؟
خود پوچھتے ہیں خاطرِ اندوہ گیں سے ہم
مجبور ہیں اب اپنے ہی قلبِ حزیں سے ہم
کب سے الجھ رہے ہیں دمِ واپسیں سے ہم
دو اشک پونچھنے کو تری آستیں سے ہم،

روشن ہے داغِ غم سے شبستانِ ہر ورق
ممنونِ زخمِ دل ہے نمکدانِ ہر ورق
اک حرفِ آرزو ہی تو ہے جانِ ہر ورق
ہوگا تمھارا نام ہی عنوانِ ہر ورق
اوراقِ زندگی کو الٹ دیں کہیں نہ ہم،

کیا آستانِ ناز یہی ہے؟ نہیں نہیں
اس جیسی سجدہ گاہ تو کوئی کہیں نہیں
کب کیسے جھک گئی ہے مجھے بھی یقیں نہیں
سنگِ درِ عدو پہ ہماری جبیں نہیں
سجدے یہ کر رہے ہیں تمھاری جبیں سے ہم،

یہ لمحۂ حیات ہے اک امتحانِ عشق
کس موڑ پر رکا ہے مرا کاروانِ عشق
کچھ گنگ ہو گئی ہے جہاں خود زبانِ عشق
دہرائی جا سکے گی نہ اب داستانِ عشق
کچھ وہ کہیں سے بھول گئے ہیں کہیں سے ہم،

پھر زرفشاں ہے آج رُخِ ماہتابِ شوق
چھیڑا ہوا ہے وقت نے جیسے ربابِ شوق
ہر لمحۂ نشاط ہے مستِ شرابِ شوق
بسمل حریمِ حسن میں ہیں کامیابِ شوق
جوشِ شباب و رنگِ رُخِ آتشیں سے ہم،

قویؔ دہلوی

جلوۂ حسن کو روپوش نہ کر دینا تھا
دے کے خوشیاں مجھے غم کوش نہ کر دینا تھا
غمِ فرقت سے ہم آغوش نہ کر دینا تھا
اپنے وعدوں کو فراموش نہ کر دینا تھا
سازِ الطاف کو خاموش نہ کر دینا تھا

کیا سناؤں میں غمِ دل کا فسانا تم کو
جان کر بھی یہی دکھ ہے کہ نہ جانا تم کو
تھا مجھے یوں تو نہ دیوانہ بنانا تم کو
نہیں آسان تھا اگر ہوش میں لانا تم کو
کسی کم بخت کو بے ہوش نہ کر دینا تھا

کس لیے بھول گئے کیوں مجھے تڑپاتے ہو
یاد آتے ہو تو آنکھوں میں سما جاتے ہو
غم کی تصویر بنا کر مجھے رلواتے ہو
آنسوؤں میں فقط اب مجھ کو نظر آتے ہو
اس طرح تو مجھے غم کوش نہ کر دینا تھا

تم نے کیوں دے کے خوشی مجھ کو دیے رنج و تعب
کچھ بتاؤ تو سہی رنجشِ بے جا کا سبب
خود بلایا تھا مجھے میکدۂ ناز میں جب
نہ اٹھانا تھا درِ میکدۂ ناز سے اب
ورنہ پہلے مجھے مے نوش نہ کر دینا تھا

تم نے ہی رسمِ محبت کا کیا تھا آغاز
اور اب خود ہی چھڑانے لگے تم دامنِ ناز
ناگوار اتنی نہ تھی سازِ وفا کی آواز
دفترِ ناز پہ کچھ بار نہ تھا اس کا نیاز
اپنے بسمل کو سبکدوش نہ کر دینا تھا

◄ پرتوِ احساس ◄

پرتوِ حُسن ایک ہے اور آئنہ خانے بہت
اک حقیقت نے بنا ڈالے ہیں افسانے بہت

غزلیں مجموعے [illegible]

- گوپال متّل
- مخمور سعیدی
- کمار پاشی
- عقیل شاداب
- رزّاق ارشد

غزلیں جن کے [illegible]

- کرشن موہن
- مخمور سعیدی
- کمار پاشی
- محسن زیدی
- کرشن مرازی
- سلیم شیرازی
- خلش دہلوی

گوپال متّل

عدو وہیں وہیں سجدے میں یاں سے پہلے تھا
جو آستاں بھی ترے آستاں سے پہلے تھا

اگر سنائیں بھی باور کرے گا کون اُسے
چمن کا رنگ جو دورِ خزاں سے پہلے تھا

تھا اپنے دل میں بھی کیا کیا نہ ولولہ یارو!
مگر وہ مرحلۂ امتحاں سے پہلے تھا

عجب ہے کیا جو وہ وہم و گماں سے برتر ہے
کہ وہ ترے مرے وہم و گماں سے پہلے تھا

انھیں بھی جان تھی پیاری جو جاں پہ کھیل گئے
پر اپنی آن سے پیار اُن کو جاں سے پہلے تھا

مخمور سعیدی

تعیّناتِ زمان و مکاں سے پہلے تھا
مرا وجود مرے جسم و جاں سے پہلے تھا

ابھی تم اُس کے کچھ آثار ڈھونڈ لو مجھ میں
وہ اک جہاں جو نمودِ جہاں سے پہلے تھا

بسا ہوا ہے اِن آنکھوں میں اب بھی اک منظر
جو اِس زمین سے اِس آسماں سے پہلے تھا

قریبِ منزلِ آخر یہ کیا خیال آیا
کہ جیسے ہم کو گزرنا یہاں سے پہلے تھا

نشاطِ جاں کی تمنّا، سکونِ دل کی اُمید
یہ سب ترے کرمِ رائیگاں سے پہلے تھا

خزاں کے بعد کچھ اُس سے حسین تر ہوگا
بہار کا جو نظارہ خزاں سے پہلے تھا

وہ ایک لفظ ہی رودادِ غم کا حاصل ہے
دلوں پہ جس کا تاثر بیاں سے پہلے تھا

کتابِ شوق معنون اُسی کے نام ہوئی
کہ اُس کا ذکر مری داستاں سے پہلے تھا

سفر کی آخری منزل نہ بن سکا مخمور
وہ سبزہ زار جو دشتِ تپاں سے پہلے تھا

کمار پاشی

وہ رنگِ بزم مری داستاں سے پہلے تھا
ورق بہار کا بابِ خزاں سے پہلے تھا

بہت دنوں سے کسی کو نظر نہیں آیا
وہ آفتاب جو اِس کہکشاں سے پہلے تھا

غبارِ وقت میں گم ہو کے رہ گیا ہوگا
وہ کارواں کہ جو اِس کارواں سے پہلے تھا

اگر وہ ہے تو جھلک دے گا میرے بعد کبھی
اگر وہ تھا مرے نام و نشاں سے پہلے تھا

مرے لیے ہی کہیں جگمگا رہا ہوگا
ترا مکاں جو رہِ بے نشاں سے پہلے تھا

اُسی کو آج ترستا ہے میرا دل پاشی
یقیں کی طرح جو گردِ گماں سے پہلے تھا

عقیل شاداب

یقیں سا کچھ مرے وہم و گماں سے پہلے تھا
"مذاقِ سجدہ مجھے آستاں سے پہلے تھا"

کھلا یہ راز جو دریا نے راستہ بدلا
رواں دواں کوئی آبِ رواں سے پہلے تھا

گھرا ہوا تھا میں نرغے میں دشمنوں کے مگر
کوئی خیال مجھے فکرِ جاں سے پہلے تھا

وہ لفظ ہوں جو ادا ہو کے بھی ادا نہ ہوا
میں حرف و صوت و زبان و بیاں سے پہلے تھا

ہوا کے دوش پہ محوِ سفر رہا تا عمر
خبر نہیں کہ گزرنا کہاں سے پہلے تھا

مرے وجود و عدم پر نہ رکھ نظر شاداب
"نہیں" کے بعد میں ہوں اور "ہاں" سے پہلے تھا

رزّاق ارشد

مجھے شعورِ سفر کارواں سے پہلے تھا
میں بے نشاں تھا مگر ہر نشاں سے پہلے تھا

مرے زوال کا ماتم کرے گا کون یہاں
وہ آسماں ہوں جو ہر آسماں سے پہلے تھا

سبک روی کے مراحل تو بعد میں آئے
کہ سامنا کسی کوہِ گراں سے پہلے تھا

یہ واقعہ مری پس ماندگی کا باعث ہے
جلوسِ وقت مرے کارواں سے پہلے تھا

وہ نغمہ زارِ مسرت بہت حسیں تھا مگر
غموں کا گنگ سمندر وہاں سے پہلے تھا

ہمیں بھی شوقِ سفر تھا اُجڑتے رستوں پر
مگر وہ بے دلیِ ہمرہاں سے پہلے تھا

گری تھی کب کوئی برقِ بلا چمن کے یہاں
یہی چمن تو مرے آشیاں سے پہلے تھا

کٹھن سفر سے میں پلٹا تو خیر مقدم کو
مرا حریف، مرے مہرباں سے پہلے تھا

کشش اسی کی ہمیں ڈھیر کر گئی ارشد
جو اک مقامِ تجسس یہاں سے پہلے تھا

کرشن موہن

مرا غم آشنا ہو کر، ترا ناآشنا رہنا
اسی باعث مرا غمگیں و آشفتہ نوا رہنا

ترا ہی لطفِ غمزہ ہے، حیاتِ عشق کا حاصل
مرے عرفان کی منزل، ترا جلوہ نما رہنا

ترا ہی حسنِ یکتا ہے، تجھے ہی زیب دیتا ہے
ہمیشہ خود نما رہنا، ہمیشہ خود ستا رہنا

یہ کیسی دوستی ہے، چھا گئی ہے برہمی جس پر
کبھی تیرا خفا رہنا، کبھی میرا خفا رہنا

مرا دل ٹوٹنے کے بعد میری زندگی یہ ہے
کسی کی یاد میں کھوئے ہوئے صبح و مسا رہنا

فقط اتنی سی ہے روداد سوز و سازِ ہستی کی
تمہارا بے وفا رہنا، ہمارا باوفا رہنا

لگا اب دھیان اپنا کرشن موہن ترکِ دنیا پر
کہ من کا روگ ہے حرص و ہوا میں مبتلا رہنا

مخمور سعیدی

جو یہ شرطِ تعلق ہے کہ ہے ہم کو جدا رہنا
تو خوابوں میں بھی کیوں آؤں خیالوں میں بھی کیا رہنا

جو تم باہر نکل پاؤ کبھی اپنے حصاروں سے
ملے گا در مرے دل کا کھلا اس گھر میں آ رہنا

عجب تھا سر پھرا کوئی، لگی تھی آگ بستی میں
اُسے منظور تھا لیکن اُنہی شعلوں میں جا رہنا

پرانے خواب پلکوں سے جھٹک دو سوچتے کیا ہو؟
مقدر خشک پتوں کا ہے شاخوں سے جدا رہنا

شجر زخمی امیدوں کے ابھی تک لہلہاتے ہیں
انھیں پت جھڑ کے موسم میں بھی آتا ہے ہرا رہنا

کبھی گزرے گا اِن گلیوں سے اک سیلِ بلا یارو!
یہ مٹی کے مکاں ڈھ جائیں گے سب ان میں کیا رہنا

گزرتے روز و شب کے درمیاں یہ بے حسی میری
کسی پتھر کا جیسے بیچ رستے میں پڑا رہنا

لہو روتی ہوئی آنکھوں میں حسرت تجھ کو پانے کی
سلگتے پانیوں میں اک لرزتے عکس کا رہنا

عجب کیا ہے اگر مخمور تم پر یورشِ غم ہے
ہواؤں کی تو عادت ہے چراغوں سے خفا رہنا

کُمار پاشی

کبھی دنیا سے لڑنا اور کبھی خود سے خفا رہنا
کہ اب اپنا مقدر ہے حریفوں میں گھرا رہنا

بہت جی کو سہائے رنج و راحت سے جدا رہنا
سبھی سے دُور اِک گمنام سی وادی میں جا رہنا

مجھے معلوم ہے، میرا سفر آسان کر دے گا
کسی کا مجھ سے کوسوں دُور مصروفِ دعا رہنا

گزر اس راہ سے تو اپنی دھن میں بن پڑے ہم کو
ہے مصرف اپنا دیواروں پہ بے مصرف لکھا رہنا

ٹھکانہ اور ڈھونڈیں یہ در و دیوار سب ڈھا دیں
جہاں ہم اجنبی خود کو لگیں، اس گھر میں کیا رہنا

اگر سوچو تو یہ اک معجزہ سے کم نہیں پاشی
جہاں کے شور و شر میں بھی مرا یوں خوش نوا رہنا

محسن زیدی

مجھے منظور ہے ہو کر تمہاری گردِ پا رہنا
مگر تم بھی یونہی موجِ ہوا بن کر سدا رہنا

کوئی آسیب گھر کر لے گا تم سے ہم نہ کہتے تھے
مناسب کب اندھیرے میں تھا دل کا در کھلا رہنا

ببولوں کا یہ جنگل ہے یہاں گل کی توقع کیا
غنیمت جانیے دامن کا کانٹوں سے بچا رہنا

اگر اب درمیاں گردِ تعلق بھی نہیں باقی
کسی سے کیوں گلہ کرنا، کسی سے کیا خفا رہنا

جہاں اک اک قدم رکھنا ہے نیزے پر قدم رکھنا
وہاں رہ کر بہت ہے اپنے قدموں کا جما رہنا

شعور و آگہی تقصیر ٹھہرے ہیں زمانے میں
بہت اچھا رہا کم جاننا، کم آشنا رہنا

مجھے اک شعلۂ احساس رکھتا ہے الگ سب سے
کہ سب کے ساتھ ہی رہنا مگر سب سے جدا رہنا

سرکتی ریت پر سارے محل ہیں ایک ہی جیسے
کسی کا کیا بکھر جانا کسی کا کیا بنا رہنا

وہ ہوں گے اور جن کو عافیت منزل کی ملتی ہے
مری تقدیر میں محسن ہے آتش زیرِ پا رہنا

کرشن مراری

ترے الفاظ کے اندر معانی کا چھپا رہنا
ترا نا آشنا رہ کر بھی کتنا آشنا رہنا
حزیں افسردہ آنکھوں میں وہ اشکوں کا تھما رہنا
جفائیں سہہ کے روز و شب کسی کا باوفا رہنا
کبھی قربت میں بھی تو درمیاں اک فاصلہ رہنا
کبھی اُس مہرباں کا مہرباں ہو کر خفا رہنا
سوالوں سے جوابوں تک جوابوں سے سوالوں تک
کہا بھی اَن کہا رہنا۔ سُنا بھی اَن سُنا رہنا
شعورِ خود نمائی میں سموئی آرزوؤں کا
کڑی گھڑیوں میں بھی بے خدشہ و با حوصلہ رہنا
اِسی میں زندگی کے کیف و کم کا لطف ملتا ہے
جُدا رہ کر کبھی ملنا۔ کبھی مِل کر جُدا رہنا

وہ راتوں کی سُبک ہلچل، وہ صبحوں کی حسیں رونق
شفق کی سُرخیوں میں شوخ سا رنگِ حنا رہنا

سلیم شیرازی

کبھی اس گھر میں جا رہنا کبھی اُس گھر میں جا رہنا
ہواؤں کو بہت مرغوب ہے "آوارہ پا" رہنا

بھٹک چکنا جب اس پتھریلی اندھی شب کے جنگل میں
تو تھوڑی دیر شہرِ جاں کی آبادی میں آ رہنا

بکھرنا ہی پڑے گا ہو کے ریزہ ریزہ بالآخر
بہت مشکل ہے اس بستی میں بن کر آئنہ رہنا

اب اپنے ہونے کا تیزاب کب تک پی سکیں گے ہم
بھلا راس آئے گا کب تک ہمیں تشنہ بنا رہنا

جُھلس ڈالے تھے بیداری کی لُو نے جسم و جاں سارے
نصیبِ گلشنِ احساس تھا پھر بھی کِھلا رہنا

خلشؔ دہلوی

"محبت بن کے جب رہنا تمنّا بن کے کیا رہنا"
بہت مشکل ہے لیکن تغافلوں میں پارسا رہنا

اُدھر اُس بزم کا دستور ہی ناآشنائی ہے
اِدھر آساں نہیں اُس بزم میں ناآشنا رہنا

پرستش گاہِ الفت میں وفا کو پوجنے والو!
تعلق تو یہ اچھا ہے مگر مشکل بنا رہنا

مقدر نارسا نکلا ہمیں یہ غم نہیں لیکن
سہا جاتا نہیں اُن کا مسلسل یوں جدا رہنا

یہ افسانہ بھی گویا یادگارِ حُسن و الفت ہے
تمھارا بے وفا ہونا ہمارا باوفا رہنا

نگاہِ ناز! اگر ہے دیکھنا تو دیکھ لے ہم کو
محبت میں کسی کا بے نیازِ مدّعا رہنا

بہاروں کو لہو سے سینچنے والے مسیحا کا
خلشؔ تکلیف دیتا ہے چمن سے لاپتا رہنا

انتظاریہ

(پروفیسر) کرامت علی کرامت

بسملؔ سعیدی کا اسلوبِ شاعری[1]

غالبؔ کے مخالفوں کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ غالبؔ کے بہت سے مشہور اشعار کا مرکزی خیال فارسی اور اردو کے پرانے اساتذہ کے اشعار سے مستعار ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو کالی داس اور شیکسپیر کے بیشتر ڈراموں کا پلاٹ بھی ان کا اپنا نہیں ہے۔ والمیک کی "رامائن"، اور ویاس کی "مہا بھارت" بھی پرانے اساطیر سے ماخوذ ہیں، لیکن اس سے والمیک، ویاس، کالی داس، شیکسپیر یا غالبؔ کی تخلیقات کی ادبی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اگرچہ ان ادیبوں کی بعض تخلیقات کا مرکزی خیال یا پلاٹ پرانا ہے، لیکن ان ادیبوں نے شخصی جذبات کی آگ میں سلگ سلگ کر اسلوب و اندازِ بیان کو جو نئی تازگی عطا کی ہے، وہ ہمیں ان تخلیقات کی بقائے دوام کی ضمانت دیتی ہے۔

دراصل، خیال کا انوکھا پن بذاتِ خود اہم ضرور ہے، لیکن اس کے اظہار کے لیے مناسب ترین طرزِ ادا یا اسلوبِ بیان (STYLE) چاہیے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ چاہے خیال کتنا ہی بلیغ، بلند اور انفرادیت کا حامل کیوں نہ ہو، لیکن اسلوب اگر اس کا ساتھ نہیں دیتا، یعنی الفاظ کا انتخاب، ان کا خارجی آہنگ، ان کی دروبست یا ان کی تراش خراش، کیفیات کے ابلاغ میں جذبات کی اضافی فراوانی کا حق ادا نہیں کرتے

---

[1] ہمیں افسوس ہے کہ تاخیر سے وصول ہونے کی وجہ سے اس اہم مضمون کو ترتیب میں مناسب جگہ نہ دی جا سکی ——— (مرتبین)

توشعر اپنے منصب کے حصول میں ناکامیاب ہوتا ہے۔ اب اس ضمن میں ذیل کے چند اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) مناسب ترین اسلوب کسے کہا جائے گا؟

(۲) کیا خیال کا انوکھا پن اور اسلوب کا انوکھا پن ـــــ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں؟

(۳) کیا اسلوب کی تازگی سے معمولی سے معمولی خیال بھی بلند پایہ شعر کا درجہ حاصل کرسکتا ہے؟

اب آیئے، ان مسائل پر سنجیدگی سے غور کریں۔

شاعر کے ذہن میں تخلیقی جذبات کے زیرِ اثر ذکاوتی تہیجات کی موسیقی کے پیدا ہونے اور الفاظ کے سانچے میں ان تہیجات کے ڈھلنے میں ایک طویل فاصلہ ہوتا ہے، اس طویل تخلیقی سفر کے دوران کبھی خیالات سے وابستہ جذبات الفاظ کو ٹٹولتے ہیں، تو کبھی الفاظ سے وابستہ جذبات خیالات کو راہ دکھاتے ہیں، لیکن جب تک جذبات اور خیالات الفاظ کے سانچے میں نہ ڈھل جائیں، تب تک انہیں شعر نہیں کہا جائے گا اور جب یہ پری الفاظ کے شیشے میں اُتر کر صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتی ہے، تو یہ محض شاعر کی ملکیت ہو کے نہیں رہ جاتی بلکہ قاری کی ہو جاتی ہے۔ یہیں سے ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ شروع ہوتا ہے۔ شعر کے مطالعے کے بعد قاری کے ذہن میں جذباتی کیفیات کی جو مختلف لہریں اُبھرتی ہیں، ان کے باہمی امتزاج سے سالم کلیت پیدا ہو، تو کہا جائے گا کہ شعر کا اسلوب کامیاب ہے۔ اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں کہ شاعر کے مرکزی جذبات و خیالات کے کتنے فی صد حصّے کا ابلاغ قاری کے ذہن میں ہو سکا ہے۔ بہرکیف کسی شعر کا اسلوب مناسب ترین ہے کہ نہیں، اس کا جواب پانے کے لیے ہمیں اس مسئلے پر غور کرنا ہوگا کہ اس شعر میں جن جذبات و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ اس سے بہتر طور پر ادا ہو سکتے تھے کہ نہیں۔ اگر بہتر طور پر ادا ہو سکتے تھے، تو ظاہر ہے، شعر کا اسلوب 'مناسب ترین' نہیں کہلا سکتا۔ نیاز فتح پوری ہر شعر کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ کوئی ناقد ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے، اس سے قبل دنیا کے کسی اور شاعر نے نہیں کہا ہوگا۔ لہٰذا جو چیز اس شاعر کو امتیازی حیثیت عطا کرسکتی ہے، وہ ہے اس کا

اسلوبِ بیان یا طرزِ ادا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تک شعر میں خیال اور اسلوب کی متوازن آمیزش نہ ہو، شعر کامیاب نہیں کہلا سکتا۔ اس ضمن میں نیاز فتح پوری جیسے زود رنج اور نکتہ سنج نقّاد سے بھی دو بڑی غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔ پہلی غلطی یہ کہ انھوں نے اسلوب کو خیال پر ترجیح دیتے ہوئے معمولی درجے کے اشعار بھی "نگار" میں شائع کیے، دوسری غلطی یہ کہ انھوں نے شعری اسلوب کو وہبی اور وجدانی تصور نہ کر کے اسے نہایت مصنوعی قرار دیا۔ انھوں نے غالبؔ، اقبالؔ اور جگرؔ تک کو نہیں چھوڑا اور ان شعراء کے کلام میں زبان و بیان کی خامیاں نکال کر ان پر اصلاح دینے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہی نا کہ غالبؔ، اقبالؔ اور جگرؔ کے اشعار اب بھی ہم اردو والوں کے اجتماعی لاشعور پر تسلّط جمائے ہوئے ہیں، جبکہ ہمارا ذہن نیازؔ کی اصلاحوں کو قبول کرنے کے لیے ذرا بھی تیار نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شاعر کا ہر منفرد شعری تجربہ اپنے اظہار کے لیے نہایت فطری طریقے پر منفرد شعری اسلوب دریافت کرتا ہے جس کا انتخاب ذہن شاعر کی وہبی اور وجدانی سطح پر ہوتا ہے۔ اس لیے اس پر اصلاح دینے کا مجاز وہی شخص ہو سکتا ہے جو تخلیق کے میدان میں اس شاعر سے بھی زیادہ مشق و مزاولت کی منزلوں سے گزرا ہو۔ ممکن ہے نیازؔ کا تنقیدی شعور غالبؔ کے مقابلے میں زیادہ پختہ ہو لیکن ان کا تخلیقی شعور یقیناً کم تر درجے کا تھا۔ اور وہ مشق و مزاولت کے ان مرحلوں سے نہیں گزرے تھے جن سے غالبؔ گزر چکے تھے اس لیے انھوں نے غالب کے شعروں میں بیان کی جن خامیوں کی نشان دہی کی ہے، ممکن ہے ان میں سے بعض سے ہم اتفاق بھی کریں، لیکن انھوں نے جو اصلاحیں دی ہیں، وہ ہمارے نزدیک کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں، اس لیے غالبؔ کے ایسے اشعار ان خامیوں کے باوجود "مناسب ترین اسلوب" کی عمدہ مثالیں پیش کرتے ہیں "مناسب ترین" اس لیے کہ قارئین کی اکثریت ان اشعار کے اسلوب اور خیال میں توازن کا سراغ پاتی ہے۔ غرض کہ اگر اکثر قارئین کسی شعر کے خیال و جذبہ اور اسلوبِ بیان کے توازن پر متفق ہوں، تو اس شعر کے اسلوب کو "مناسب ترین اسلوب" کا درجہ دیا جا سکتا ہے تا وقتیکہ کوئی دوسرا ماہرِ فن اس پر نظرِ ثانی کر کے اسے بہتر نہ بنا دے۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی پختہ مشق شاعر کے قلم سے جو چیز بے ساختہ نکل جاتی ہے، اس میں کسی دوسرے کی نظرِ ثانی یا ترمیم و اصلاح کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ جس طرح ہر اچھے شعر کا اپنا منفرد اسلوب ہوتا ہے جس کی وجہ [illegible]

سے الگ طور پہ پہچانا جاتا ہے، اُسی طرح ہر" اچھے شاعر" کا بھی اپنا منفرد اسلوب ہوتا ہے (جو اس کے مختلف اشعار کے اسالیب کی مشترک خصوصیات سے مرتب ہوتا ہے) جس کی وجہ سے وہ دوسرے شاعروں سے الگ طور پر پہچانا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں کہا جاتا ہے کہ "شاعر کا ایک منفرد اسلوب یا منفرد لہجہ ہے۔" لیکن کوئی شاعر منفرد لہجے کا مالک ہے کہ نہیں یہ فیصلہ کرنے کے لیے خود قاری کا وسیع المطالعہ ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ قاری عموماً اسی شاعر کے لہجے سے زیادہ مانوس ہوتا ہے جس کا اس نے زیادہ مطالعہ کیا ہو۔ اس لیے اگر اس نے مختلف شعراء کا یکساں طور پر گہرا اور وسیع مطالعہ نہ کیا ہو، تو اس سلسلے میں اس کی رائے غلط ہوسکتی ہے۔ مثلاً جس شخص نے صرف غالب کے کلام کا غائر مطالعہ کیا ہے، وہ میر نظام الدین ممنون دہلوی کے بارے میں کہے گا کہ اس کا لہجہ غالب سے ملتا جلتا ہے، جبکہ وہ شخص جس نے صرف ممنون کا مطالعہ کیا ہے کہے گا کہ غالب نے ممنون کے لہجے میں شعر کہے ہیں دونوں شاعروں کے چند گنے چنے متحد الخیال اشعار کی بنا پر اس طرح کے عمومی نتائج غلطی پر مبنی قرار دیے جائیں گے، کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ مجموعی طور پر ان دونوں شاعروں کے لب و لہجہ میں بعد المشرقین تھا۔

بعض شعراء کے یہاں شروع سے آخر تک تقریباً یکساں نوعیت کا اسلوب پایا جاتا ہے (مثلاً امیر، اقبال، جوش وغیرہ)، اور بعض کے یہاں شاعری کے مختلف ادوار میں مختلف قسم کے اسالیب پائے جاتے ہیں (مثلاً غالب، امجد نجمی، مظہر امام وغیرہ) ایسے میں کسی شاعر کا منفرد اسلوب کیا ہے، یہ فیصلہ کرنا کبھی کبھی مشکل ہو جاتا ہے۔ غالب نے "چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ" کے مصداق کبھی طرز بیدل میں ریختہ کہنے کی کوشش کی تو کبھی ناسخ اور میر کی طرز کو اپنایا۔ لہٰذا آپ غالب کے اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے ان کے کس دور کی شاعری کو پیش کیجیے گا؟ دراصل، اس پیچیدہ مسئلے کو میں ایک اور زاویے سے دیکھتا ہوں۔ وہ یہ کہ الفاظ کا صوتی آہنگ ذکاوتی تہیجات کی کیفیتی سے گہری مطابقت رکھتا ہے۔ اس وجہ سے شعر کے بحور و اوزان کا انتخاب شاعر تحت الشعور اور لاشعور کی سطح پر ہی ہوا کرتا ہے۔ بعض شعراء کو بعض مخصوص بحریں غیر شعوری طور پر زیادہ مرغوب ہوتی ہیں۔ ممکن ہے بعض خارجی اثرات کی بنا پر شاعر کے مختلف ادوار کے ڈکشن میں نمایاں فرق پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے بادی النظر میں شاعر کے

اسلوب میں نمایاں تبدیلی نظر آئے گی، لیکن مجموعی طور پر بحور و اوزان کے طرزِ انتخاب میں اُس وقت تک کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہیں ہوگی جب تک کہ کوئی خارجی واقعہ یا حادثہ شاعر کی شخصیت کی بنیاد کو متزلزل کرکے اس کے ذہن و شعور کو اس تبدیلی پر مجبور نہ کردے۔ آپ غالب کے جس دور کے کلام کا جائزہ لیجیے، ان کے یہاں اُلٹ پھیر کر رمل، مضارع، ہزج، مجتث اور خفیف انہیں پانچ بحروں کا سالم اور مزاحف صورتوں میں استعمال بکثرت نظر آئے گا۔ آخر کچھ تو غیر شعوری سبب ہوگا جس کی وجہ سے غالب کے دیوان میں مذکورہ پانچ بحروں کا بکثرت استعمال ہوا ہے۔ ان کے علاوہ بحرِ منسرح میں صرف ایک غزل اور بحرِ متقارب اور بحرِ رجز میں صرف تین تین غزلیں پائی جاتی ہیں اور مذکورہ آٹھ بحروں کے سوا کسی اور بحر کا استعمال ان کے یہاں نظر نہیں آتا! غرض کہ کسی شاعر کے مختلف ادوار میں مستعمل بحروں کا تقابلی مطالعہ نیز مختلف شاعروں کے یہاں استعمال شدہ بحروں کا تقابلی تجزیہ اسلوبیات (STYLISTICS) کے سلسلے میں ایک نیا باب کھولتا ہے۔

جہاں تک الفاظ کے استعمال کا تعلق ہے، ہر لفظ کا ایک خاندان ہوتا ہے اور اس خاندان کی ایک طویل تاریخی روایت ہوتی ہے جو کبھی واضح طور پر اور کبھی مبہم طور پر ہمارے اجتماعی لاشعور پر اثرانداز ہوتی ہے۔ بعض اوقات الفاظ اپنے خاندان کے خدوخال بھی برقرار رکھتے ہیں اور اس کے اوصاف بھی، کبھی کبھی ظاہری خدوخال برقرار رہتے ہوئے اوصاف بدل جاتے ہیں، اس طرح ان الفاظ کی معنویت میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی الفاظ کے خدوخال اور اوصاف دونوں بدل جاتے ہیں، اس طرح صوتی اعتبار سے بھی ان میں فرق پیدا ہو جاتا ہے اور معنوی اعتبار سے بھی۔ کوئی لفظ اپنے خاندان کی تمام تاریخی روایات کو ساتھ لیے ہوئے اب تک جن جن مقامات (SITUATIONS) پر استعمال ہوا ہے ان سب کے مجموعی اثرات سے شعر میں (جہاں یہ آیا ہے) اس لفظ کی معنویت مرتب ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی لفظ کے صوتی آہنگ کے سلسلے میں بھی اس لفظ کے خاندان کی تاریخی روایت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا مثلاً عربی کے وہ الفاظ جو اُردو میں آئے ہیں، ان میں صوتی اعتبار سے ع "کو" ا" کی حیثیت سے "ض۔ ظ اور ذ" کو "ز" کی حیثیت سے "ث" اور "ص" کو "س" کی حیثیت سے اور "ط" کو "ت" کی حیثیت سے اپنایا گیا ہے۔ اس لیے عربی میں [illegible]

جو صوتی تاثرات پیدا کرتے ہیں، اُردو میں اِن کے تاثرات اُن سے مختلف ہوتے ہیں۔ اُردو میں سنسکرت کے بیشتر الفاظ لسانیاتی تبدیلیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ چونکہ قدیم سنسکرت اور قدیم ایرانی زبانیں دو بہنیں کہلاتی ہیں جن میں بہت سے الفاظ (معمولی صوتیاتی تبدیلیوں کے ساتھ) مشترک تھے، اس لیے اُردو کے بہت سے الفاظ کا سلسلہ ان دونوں قدیم زبانوں سے جا ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام لسانی اور تاریخی روایات کے اثرات سے اُردو کے کسی شعر کا اسلوب دامن بچا نہیں سکتا۔

بعض آوازیں ایسی ہوتی ہیں جن کا بار بار استعمال کسی ایک زبان میں کرختگی اور تنافر پیدا کرتا ہے جبکہ بعض دوسری زبانوں میں ایسا نہیں کرتا۔ مثلاً "ٹ" اور "ڈ" کا استعمال اُردو میں تنافر پیدا کرتا ہے، جبکہ انگریزی کا شاید ہی کوئی جملہ ہو جس میں "t" اور "d" کا استعمال نہ ہو۔ کون سی آواز کس زبان میں تنافر پیدا کرتی ہے، اس کا تعلق اس زبان کے مخصوص مزاج سے ہے جس کی تشکیل میں نسلی یا اجتماعی لاشعور کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ چونکہ زبان کے مخصوص مزاج کی بات چلی ہے، اس لیے اس سلسلے میں عرض کرنے دیجیے کہ شاعری کے بعض صنائع، بدائع یا معائب ایسے ہوتے ہیں جو اس زبان کے مخصوص مزاج سے تعلق رکھتے ہیں اگرچہ دوسری زبانوں میں ان کی اہمیت نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان چیزوں کی طرف شاعر خصوصی توجہ نہ دے، تو اس کا شعری اسلوب کامیاب نہیں کہلا سکتا۔

کسی شاعر کے مختلف شعروں کے اسالیب کی مشترک خصوصیات سے اس شاعر کا منفرد اسلوب مرتب ہوتا ہے (بشرطیکہ ان خصوصیات میں کچھ انفرادیت موجود ہو) شاعر کے اسلوب کی پہچان عام طور پر اس کی لفظیات سے بھی ہوا کرتی ہے۔ چونکہ ہر جدید زبان ایک یا کئی کلاسیکل زبانوں سے پیدا ہو کر متعدد مدارج طے کرتے ہوئے موجودہ حالت کو پہنچی ہے، اس لیے جو شاعر عام بول چال کی زبان میں شاعری کرے گا، اس کا اسلوب اس شاعر سے مختلف ہوگا جو لفظیات کا ذخیرہ کلاسیکل زبانوں سے قبول کرے۔ میرؔ کی شاعری اور غالبؔ کے ابتدائی دور کی شاعری میں اسلوب کے اعتبار سے جو نمایاں فرق ہے، اس میں لفظیات کے فرق کو بڑا دخل ہے۔ ظاہر ہے کہ لفظیات کے فرق کی بنا پر دو شاعروں کے شعری رویّہ میں بھی نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ بہرحال سنسکرت

کے ریتی (रीति) اسکول کے نقادوں نے بعض مخصوص ماخذوں (یعنی اپ بھرنشوں) سے لی گئی لفظیات پر مبنی اسلوب کو شاعری کے لیے لازمی ولابدی قرار دیا تھا۔

مندرجۂ بالا سطور میں جن خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے، دراصل اسلوبِ شاعری کا دائرۂ عمل ان سب سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ کیونکہ لفظ اور معنی کی طرح اسلوب اور خیال کا رشتہ بھی جسم و جاں کا رشتہ ہے۔ ایک کو دوسرے سے الگ کر دیجیے تو دونوں کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے مڈلٹن موری (Middleton Murry) نے کہا تھا کہ "اسلوب، تحریر کی کوئی علیحدہ صفت (Quality) نہیں، بلکہ بذاتِ خود تحریر ہے"۔ لہٰذا اگر خیال میں انوکھا پن ہو تو اسلوب میں انوکھا پن لازماً آئے گا۔ اگر خیال فرسودہ ہوگا تو اسلوب میں بھی تازگی نہیں ہوگی۔ غرض کہ خیال کا انوکھا پن اور اسلوب کا انوکھا پن ـــــ یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اُردو کے پرانے اساتذہ کا ایک عام غلط خیال یہ ہے کہ اسلوب کی تازگی سے معمولی سے معمولی خیال بھی بلند پایہ شعر پر منتج ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ اگر شاعر کا خیال معمولی درجے کا ہو تو اسلوب میں تازگی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اسلوب کی تازگی کے لیے خیال کی تازگی پہلی شرط ہے اور جس خیال میں تازگی ہو، اُسے "معمولی خیال" نہیں کہا جا سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ سلاستِ الفاظ اور سادگیِ بیان کی وجہ سے بعض عمدہ اشعار بھی بادی النظر میں بہت ہی معمولی نظر آتے ہیں، لیکن آپ اگر ان کے الفاظ کے تلازمات پر غور کرتے جائیں، تو آپ کو ان تلازمات میں نفسیاتی پیچیدگیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آئے گا۔ اس اعتبار سے، مجھے میرؔ کے سادہ سے سادہ شعر میں بھی غالبؔ کے مشکل سے مشکل شعر سے زیادہ پیچیدگیاں نظر آتی ہیں۔

اب آئیے، مندرجۂ بالا اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بسمل سعیدی کے شعری اسلوب کا جائزہ لیں۔ بسمل سعیدی دراصل فراقؔ گورکھپوری، حفیظ جالندھری، امجد نجمی، عندلیب شادانی وغیرہم کے ہم عصر ہیں۔ اس لیے انہیں بیسویں صدی کے قدمائے سخن میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے اور میرے زمانے میں تقریباً پینتیس سال کا فرق ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ میں نے جب ان کا شعری مجموعہ "اوراقِ زندگی" پہلی بار پڑھا، تو ان کی شاعری سے مجموعی طور پر متاثر نہ ہو سکا۔ لیکن جب میں نے دو تین بار اس کا مطالعہ کیا تو مجھ پر ان

کی شاعری کی نئی نئی خوبیاں ظاہر ہوتی رہیں اور مجھے حیرت میں ڈالتی رہیں۔ ان کے بیشتر اشعار نے مجھے محض اس لیے متاثر کیا کہ انہوں نے ان اشعار میں اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے "مناسب ترین اسلوب" کو اپنایا ہے۔

بسمل سعیدی کے اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے میں بات، ان کے صنائع اور بدائع سے شروع کرنا چاہوں گا۔ ہمارے کلاسیکل ادب میں علمِ بدیع کا مرتبہ علمِ معانی و بیان کے بعد سمجھا گیا ہے۔ اسی طرح سنسکرت کے وہ نقاد جو ادب میں رس (یا جذبۂ لطیف) کے قائل ہیں۔ النکار (یا صنائع اور بدائع) کو محض زیورات کا درجہ دیتے ہوئے انہیں عروسِ سخن کی ظاہری آرائش کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن بسمل سعیدی کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں مختلف صنائع اور بدائع غیر شعوری طور پر آئے ہیں، اور وہ بھی آٹے میں نمک کی طرح، چونکہ ان کے لاشعور نے ان کی لاعلمی میں ان صنعتوں کا انتخاب کیا ہے، اس لیے یہ خوبیاں ان کی شاعری میں جذب ہو کر ان کے شعری اسلوب کا جزوِ لاینفک بن گئی ہیں۔ چونکہ ان صنائع اور بدائع کا خود اُردو شاعری کے مزاج سے بہت گہرا تعلق ہے، اس لیے ان کا ذکر کیے بغیر بسمل سعیدی کے اسلوبِ شاعری کا مکمل جائزہ ممکن نہیں۔

بسمل سعیدی کے یہاں لفظی صنائع میں سے صنعتِ فوقانیہ، صنعتِ تحتانیہ، صنعتِ تکرار، صنعتِ رد العجز علی الصدر، صنعتِ نظم النثر اور صنعتِ قطع الحروف کی اور معنوی صنائع میں سے صنعتِ مقابلہ اور صنعتِ تضاد کی مثالیں مل جاتی ہیں، ذیل کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے :۔

(۱) صنعتِ فوقانیہ یا صنعتِ فوق النقاط :۔

ذیل کے اشعار کے جن مصرعوں کے نیچے لکیریں کھینچی گئی ہیں، ان میں تمام نقطےدار حروف کے نقطے ان حروف کے اوپر ہی ہیں۔ اس طرح ان مصرعوں میں صنعتِ فوقانیہ یا صنعتِ فوق النقاط کا تجربہ انجام دیا گیا ہے :۔

زندگی کو سنبھال کر رکھیے | زندگی موت کی امانت ہے

عشق ہوتا ہے دل کا اک عالم | دل کا عالم بیاں نہیں ہوتا

تم نہ ہوتے اگر زمانے میں | کس سے اٹھتا ستم زمانے کا

(۲) صنعتِ تحتانیہ یا صنعتِ تحت النقاط :۔

ذیل کے شعر کے دوسرے مصرعے میں تمام نقطے دار حروف کے نقطے ان حروف کے نیچے ہیں۔ اس طرح یہاں صنعتِ تحتانیہ یا صنعتِ تحت النقاط کا تجربہ انجام دیا گیا ہے:

اب تو اس درد کو میں دل سے نہ جانے دوں گا | اب اگر وہ بھی مرے درد کا درماں ہوں گے

(۳) صنعتِ تکرار:-

ذیل کے شعر میں "آئیں" اور "کہاں" کی تکرار سے صنعتِ تکرار معرضِ وجود میں آئی ہے۔

دام آئیں یا نہ آئیں نظر، تو یہ دیکھ لے | بکھرے پڑے ہیں باغ میں دانے کہاں کہاں

(۴) صنعتِ ردالعجز علی الصدر مع التکرار:-

اس صنعت کے تحت پہلے مصرعے کے پہلے رکن (یعنی صدر) میں جو لفظ استعمال ہوتا ہے، مصرعِ ثانی کے آخری رکن (یعنی عجز) میں وہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

تھا مجھے خوفِ شریعت کہ وہ ہے میرے خلاف | میری جانب ہے مشیّت مجھے معلوم نہ تھا

کیا جذب ہو رہا ہوں میں جلووں میں حسن کے | اب عشق ساتھ چھوڑ رہا ہے یہاں سے کیا

ہے ان کی جنبشِ ابرو پہ آبرو کا مدار | جنہیں خبر بھی نہیں ہے کہ آبرو کیا ہے

ہم اُٹھ کے آ سکے نہ درِ نازِ حسن سے | سجدوں نے جب کہا کہ پریشاں رہیں گے ہم

(۵) صنعتِ نظم النثر:-

بسمل سعیدی نے ایسے اشعار بھی کہے ہیں کہ ان کو اگر نثر کی شکل میں پڑھا جائے تو نحوی ترتیب میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس طرح ان اشعار میں صنعتِ نظم النثر کا تجربہ انجام دیا گیا ہے۔ مثلاً:

میں نے دیکھا ہے ان کی محفل میں
کچھ زمان و مکاں نہیں ہوتا
آہ کا کیوں اثر نہیں ہوتا
دردِ دل دردِ سر نہیں ہوتا

(۶) صنعتِ حذف یا صنعتِ قطع الحروف :-

کسی شعر میں کسی مخصوص حرف کا استعمال نہ کرنا ہی صنعتِ حذف یا صنعتِ قطع الحروف کہلاتا ہے۔ مثلاً کسی شعر میں اگر "الف" کا استعمال نہ ہوا ہو تو اسے "صنعت قطع الالف" کہا جائے گا۔ دراصل اردو زبان میں الف کا استعمال اس قدر زیادہ ہے کہ اس سے احتراز کرنا آسان نہیں۔ لہٰذا نجم الغنی رام پوری فرماتے ہیں کہ "صنعتِ قطع الالف سب سے زیادہ مشکل ہے"۔ (بحر الفصاحت، دوسرا ایڈیشن صفحہ ۹۷۶)۔ لیکن بسمل سعیدی کا ذیل کا شعر اس مشکل ترین صنعت میں ہے :-

عدو سے نہ مجھ سے نہ محفل سے پوچھے
تجھے تو کوئی تیرے ہی دل سے پوچھے

(۷) صنعتِ مقابلہ :- اس کی مثال ملاحظہ فرمائیے :-

میں بے نیاز سہی تم سے بھی محبت میں — مگر تمہاری محبت سے بے نیاز نہیں

(۸) صنعتِ تضاد :- ذیل کے شعر میں "رو رہا ہوں" اور "روئے گا"۔ "آج" اور "کل"۔ "سارے جہاں کے واسطے" اور "سارا جہاں میرے لیے" کا تضاد ملاحظہ فرمائیے :-

رو رہا ہوں آج میں سارے جہاں کے واسطے
روئے گا کل دیکھنا سارا جہاں میرے لیے

اب آئیے، بسمل سعیدی کے عروضی شعور کا جائزہ لیں، کیونکہ اسی عروضی شعور سے شاعر کی موسیقیانہ حس کا اندازہ بخوبی لگ سکتا ہے۔ بسمل کے یہاں زیادہ تر غزلیں بحرِ ہزج اور بحرِ رمل میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد نمبر بحرِ مضارع اور بحرِ مجتث کا ہے۔ ان کے شعری مجموعے "اوراقِ زندگی" کی نظموں اور غزلوں میں جو مختلف بحریں (سالم اور زحافات کے ساتھ) استعمال ہوئی ہیں، ان کی تعداد کچھ اس طرح ہے۔

بحرِ ہزج	۹۳	بحرِ خفیف	۱۲
بحرِ رمل	۴۹	بحرِ متقارب	۹
بحرِ مضارع	۳۸	بحرِ رجز	۴
بحرِ مجتث	۳۱	بحرِ کامل	۳

لیکن میری رائے میں شاعر کی موسیقیانہ حس کے تجزیہ کے سلسلے میں بحور کا اس طرح کا مطالعہ نہایت بھونڈا طریقہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے عروض دانوں نے مختلف زحافات کو محض نام دینے کی سہولت کے لیے ایک ہی بحر کے تحت رکھا تھا، ورنہ ان مختلف زحافات کے صوتی آہنگ میں اس قدر بعد المشرقین ہوتا ہے کہ ان سب کو ایک ہی بحر کے تحت رکھنے کا کوئی معقول جواز مجھے نظر نہیں آتا۔ مثلاً بحرِ رمل مثمن مخبون محذوف مقطوع (فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن) اور بحرِ رمل مثمن مشکول (فعلات فاعلاتن فعلات فاعلاتن) صوتی آہنگ میں زمین آسمان کا فرق ہے حالانکہ عروض دانوں نے ان دونوں کو بحرِ رمل کے تحت رکھا ہے۔ لہٰذا کسی شاعر کی موسیقیانہ حس کا اندازہ لگانا ہو تو مختلف سالم بحروں اور مختلف زحافات کا الگ الگ طور پر مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بسمل سعیدی کے یہاں ذیل کی پانچ بحریں کثرت سے پائی جاتی ہیں :-

(۱) مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف، (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن) کُل تعداد ۴۵

(۲) مجتث مثمن مخبون محذوف (مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن) ... کُل تعداد ۳۱

(۳) ہزج مثمن سالم (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن) .. ... کُل تعداد ۲۷

(۴) رمل مثمن محذوف (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) .... کُل تعداد ۲۵

(۵) رمل مثمن مخبون محذوف مقطوع (فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن) .. کُل تعداد ۲۰

آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ ان پانچوں بحروں میں تیز رفتاری نہیں بلکہ ایک طرح کا ٹھہراؤ ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ بسمل کے لہجے میں بھی مجموعی طور پر، تیزی اور کرختگی نہیں بلکہ نرمی، متانت اور سنجیدگی ہے۔ مندرجۂ بالا پانچ بحروں کے علاوہ بحرِ خفیف مسدس مخبون محذوف (فاعلاتن مفاعلن فعلن) ۱۲ بار اور بحرِ ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف (مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن) ۱۰ بار استعمال ہوئی ہیں۔ ورنہ باقی تمام بحریں پانچ یا پانچ سے کم مرتبہ استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً بحرِ متقارب مثمن مقبوض اثلم پانچ بار، بحرِ متقارب مثمن سالم اور بحرِ رجز مثمن مطوی مخبون چار چار بار، بحرِ ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف، بحرِ مضارع مثمن اخرب اور بحرِ کامل مثمن سالم تین تین بار، بحرِ رمل مسدس مخبون محذوف دو بار اور بحرِ رمل مثمن مشکول صرف ایک ایک بار استعمال ہوئی ہیں۔

سید مبارک علی نے غالب سے متعلق کہا ہے "مرزا نے ایک دو بحریں ایسی بھی استعمال کی ہیں جو دوسرے شعراء کے یہاں شاید ہی ملیں گی اور ان میں شعر کہنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ (۱) بحر منسرح مثمن مطوی منحور (۲) بحر ہزج مثمن اشتر (۳) بحر رمل مثمن مشکول"۔ ان تینوں بحروں میں سے پہلی دو بحروں کا استعمال بسمل سعیدی کے یہاں بھی نظر نہیں آتا، لیکن تیسری بحر (وزن فعلات فاعلاتن فعلات فاعلاتن) میں ایک غزل "جو مرا خیال بھی ہو کہ تجھے میں بھول جاؤں" ضرور ملتی ہے۔ اس کے برعکس غالب کے یہاں بحر کامل مثمن سالم (وزن متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن) کی کوئی مثال نظر نہیں آتی جبکہ بسمل سعیدی کے یہاں تین غزلیں اسی بحر میں ہیں۔ اقبال نے بھی اپنی مشہور غزل "کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں" اسی بحر میں کہی ہے۔

جہاں تک ذخیرۂ الفاظ کا تعلق ہے بسمل سعیدی کی نظموں کا ڈکشن، ان کی دیگر اصناف سخن کے ڈکشن سے مختلف ہے۔ ان کی نظموں میں جوش کی طرح گھن گرج اور مرعوب کن الفاظ کی بازی گری نظر آتی ہے۔ مثلاً

شام کا یہ منظر رنگیں، یہ رنگ آفتاب — طشت زرین شفق پر جس طرح جام شراب
جیسے گل اندام کوئی چھپی ملبوس میں — شمع روشن جس طرح یاقوت کے فانوس میں۔

(نظم — شام)

لیکن ان کی بیشتر غزلوں، مسلسل غزلوں اور مرثیوں میں سادگی بیان اور سلاست الفاظ کے ساتھ ایک مخصوص قسم کی حزنیہ لے پائی جاتی ہے جس کے اثرات ذہن پر دیرپا ثابت ہوتے ہیں۔ ذیل کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے :-

اللہ ری ظلمت شب غم — تاروں کی سیاہ روشنی ہے
یاد ان کی ہے دل میں اب بھی لیکن — آواز سی ایک دور کی ہے

(غزل کے اشعار)

کچھ ایسا بار ہوا ہوں میں دوش ہستی پر — کہ ہر جنازے پہ اپنا گمان ہے گویا
کچھ اس خوشی سے بڑھا جا رہا ہوں موت کی سمت — کہ آہ موت بھی اک امتحان ہے گویا

(مسلسل غزل)

اُبھر آیا جو ترا پیر نور رنگیں ان میں — بن گئے پھول تری قبر پہ گر کر آنسو

یہ تو اک قبر کی ہیں خاک کے ذرّے بسمل — نہ ستارے ہیں فلک کے نہ یہ گوہر آنسو

(مرثیہ، آبشارِ اشک)

لیکن میں کہوں گا کہ شاعر کے عروضی شعور اور موسیقیانہ حس کے اعتبار سے بسمل کی غزلیں ان کی دیگر اصناف سے خود بخود الگ طور پہ پہچانی جاتی ہیں۔ فی الحال ان کی غزلوں سے متعلق بحث کو الگ رکھیے اور ان کی نظموں، مرثیوں اور مسلسل غزلوں میں جو داخلی یکسانی، ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس پر غور کیجیے:۔

[ذیل کی جدول میں مرثیوں کو نظموں کے ساتھ اس لیے دکھایا گیا ہے کہ ان دونوں اصنافِ سخن کے مزاج میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں]

بحر کا نام	وزن	نظموں اور مرثیوں میں کتنی بار استعمال ہوئی ہے	مسلسل غزلوں میں کتنی بار استعمال ہوئی ہے
بحر ہزج مثمن سالم	مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن	۴	۲
بحر ہزج مسدس محذوف	مفاعیلن مفاعیلن فعولن	۱	صفر
بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف	مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن	۴	۳
بحر رمل مثمن مخبون محذوف مقطوع	فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن	۵	۴
بحر رمل مثمن محذوف	فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن	۶	۴
بحر رمل مثمن مشکول	فعلاتُ فاعلاتن فعلاتُ فاعلاتن	۱	صفر
بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف	مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن	۶	۹
بحر مضارع مثمن اخرب	مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن	۳	صفر
بحر مجتث مثمن مخبون محذوف	مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن	۵	۹
بحر خفیف مسدس مخبون محذوف	فاعلاتن مفاعلن فعلن	۳	صفر
بحر متقارب مثمن مقبوض اثلم	فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن	۴	صفر
بحر رجز مثمن مطوی مخبون	مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن	۱	صفر

اب آپ کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مختلف بحروں میں کہی گئی نظموں اور مسلسل غزلوں کی تعداد میں فرق دو، تین یا چار سے زیادہ نہیں (یہاں مرثیوں کا ذکر ہم نظموں ہی کے

ذیل میں کرتے ہیں، جبکہ ان کی "نظموں" اور "غزلوں" میں اس نوعیت کا تناسب نظر نہیں آتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بسمل سعیدی کی شخصیت "غزلوں" اور "نظموں" کے درمیان دو حصّوں میں بٹی ہوئی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں کا اسلوب الگ ہے اور ان کی نظموں، مسلسل غزلوں اور مرثیوں کا اسلوب الگ، موخر الذکر تینوں اصناف میں ممکن ہے آپ کو ڈکشن کے اعتبار سے اسلوب کا تھوڑا بہت فرق نظر آئے۔ لیکن در اصل تینوں اصناف کے شاعر کی شخصیت کے واحد رُخ کی آئینہ دار ہونے کی وجہ سے ان تینوں کے اسالیب داخلی سطح پر ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

جہاں تک ذخیرۂ الفاظ کے استعمال اور لفظوں کی دروبست کے سلسلے سے شعری اسلوب کے تجزیہ کا تعلق ہے۔ بسمل سعیدی کے یہاں عام بول چال کی زبان بھی نظر آتی ہے اور فارسی آمیز زبان بھی۔ ان کے وہ اشعار جن میں فارسی تراکیب کی بہتات ہے ان میں تکلف اور تصنع زیادہ ہے، ان میں وہ دلکشی اور دلآویزی نہیں ملتی جو ان کے سہل اور عام فہم اشعار میں پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں ایک ہی غزل کے اشعار میں بھی دونوں طرح کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ ان کے فارسی آمیز اشعار میں ایک طرح کا مرعوب کن لہجہ پایا جاتا ہے، جبکہ ان کے سیدھے سادے اشعار میں تڑپ، چبھن، گھلاوٹ، اور سوز و گداز کے عناصر بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ للہٰذا ان کے سیدھے سادے اشعار اسلوب اور لب و لہجہ کے اعتبار سے میر کے اشعار سے بہت قریب ہیں۔ ان کے تکلف و تصنع آمیز اشعار کی مثالیں یہ ہیں :-

تا کجا آوارۂ نظارہ چشمِ حسن دوست　　　جمع اک مرکز پہ کیوں کر حسنِ عالم کیجیے

پھر فیضِ غیرِ حسن سے ہے مستفید عشق　　　حسبِ قدیم کعبۂ دل سومنات ہے

جو نظر کہ نزہتِ گل پہ ہے وہ نظر ہے زحمتِ خار پر　　　کہ سوادِ شامِ خزاں بھی تو ہے فروغِ صبحِ بہار پر

لیکن ان مرعوب کن اشعار کے برخلاف بسمل سعیدی کے ایسے اشعار کی دلکشی اور جاذبیت ملاحظہ فرمائیے جو سہل ممتنع کی عمدہ مثالیں پیش کرتے ہوئے ان کے منفرد رنگِ سخن کی جائز نمائندگی کرتے ہیں۔

کیا زیست تباہ ہو گئی ہے — ہر سانس اک آہ ہو گئی ہے
اب ہجر کی رات چاندنی سے — کچھ اور سیاہ ہو گئی ہے
اے وقت نہ پوچھ تیرے ہاتھوں — کیا چیز تباہ ہو گئی ہے
سرسبز وہ کشتِ شوق اپنی — بے برگ و گیاہ ہو گئی ہے

اپنے دامن سے مرے پونچھنے والے آنسو — دامنِ خاک نے اب آکے اُٹھا لے آنسو

زمانہ آنکھ سے مجھ کو گرا کے بھول گیا — اک اشک تھا میں زمانے کی چشمِ تر کے لیے

یا رب جنونِ عشق میں وہ لمحہ اب نہ آئے — محسوس جس میں ہو کہ یہ کیا ہو گیا مجھے

اُلجھے سے جا رہے ہیں کچھ انفاسِ زندگی — ٹوٹے گا سلسلہ یہ کبھی درمیاں سے کیا

اب عشق رہا نہ وہ جنوں ہے — طوفان کے بعد کا سکوں ہے

ممکن ہے، اندازِ بیان کی سادگی اور الفاظ کی سلاست کی وجہ سے، ان اشعار کے خیالات بادی النظر میں معمولی معلوم ہوں، لیکن ان میں ذہنی اور جذباتی پیچیدگیوں کا اس قدر انوکھا اظہار ہوا ہے کہ ہر شعر کی تشریح میں ایک ایک دفتر سیاہ کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ان اشعار کے خیالات میں ندرت بھی ہے اور تازگی بھی، اس لحاظ سے ان کے اسلوب میں بھی ندرت اور تازگی کا سراغ ملتا ہے۔

بسمل سعیدی بنیادی طور پر غزل ہی کے شاعر ہیں لیکن ان کی نظموں کا دہ باب جو "آبشارِ اشک" کے نام سے موسوم ہے بہت موثر اور وقیع ہے اس باب کی تمام نظمیں شاعر کی جواں سال لڑکی ثریا عندلیب سعیدی کے حادثۂ انتقال سے متعلق ہیں [illegible] ہی کے نام میں کہی گئی ہیں۔ ان نظموں کا ہر لفظ گویا شاعر کے [illegible] ان کو پڑھ کر امیر خسرو اور اقبال کی ان نظموں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے [illegible] نے [illegible] والدہ مرحومہ کی یاد میں [illegible] سعیدی کی [illegible] نظموں [illegible]

مسافرانِ عدم کس طرف سے جاتے ہیں
کسی طرف بھی کوئی نقشِ کارواں نہ ملا

نہاں ہیں جس میں دُرِ اشکِ چشم و دل میرے
وہ ڈھیر خاک کا، وہ گنجِ شائگاں نہ ملا

جھلس گئی تھی کلی اک جس آتشِ گل سے
وہ آگ کیا مجھے اس آگ کا دھواں نہ ملا

کہیں تڑپ کو اُٹھے میرے پیار کے سجدے
مگر جبیں کو مری کوئی آستاں نہ ملا

ہر ایک لوح پہ اک داستانِ مرگ ملی
کسی بھی لوح پہ عنوانِ داستاں نہ ملا

ملا ہے زیست کی کشتی کو موت کا ساحل
ترے سفینۂ ہستی کو بادباں نہ ملا

(نظم۔ ثریا عندلیب سعیدی)

ضبطِ گریہ سے جو آنکھوں میں کھٹک ہوتی ہے
خشک ہوتے ہیں تو ہو جاتے ہیں کنکر آنسو

بہہ چکے قلب و جگر جب تو یہ آنسو کیسے
کہیں آنکھیں تو نہ بہنے لگیں بن کر آنسو

کاش آنکھوں میں کبھی آئیں جو رہ جاتے ہیں
بن کر آتش کدۂ دل میں سمندر آنسو

جن کو رونا ہو وہ ہنس ہنس کے بھی رو لیتے ہیں
قہقہوں میں بھی بدل جاتے ہیں اکثر آنسو

اُبھر آیا جو ترا پرتوِ رنگیں ان میں
بن گئے پھول تری قبر پہ گر کر آنسو

(نظم آبشارِ اشک)

غالبؔ نے بھی غزل کے فارم میں مرثیے کہے ہیں (مثلاً "درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے"، اور "لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور")، لیکن غالبؔ اور بسملؔ کے اسالیب میں فرق ہے۔ غالبؔ آنسو بہا کر اور "ہائے ہائے" کی آواز بلند کر کے اپنے دل کا بوجھ کسی حد تک ہلکا کر لیتے ہیں جبکہ بسملؔ سعیدی کا زخم ضبطِ گریہ سے اور بھی گہرا ہو جاتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ قارئین کو بھی اپنے اس غم میں برابر کا شریک کر لیتے ہیں یہی ان کے اسلوب کی کامیابی کی روشن دلیل ہے۔

خود بسملؔ سعیدی شاعری کو نہ پیغمبری تصور کرتے ہیں، نہ جادوگری، بلکہ اسے محض اپنے جذباتِ قلبی کا اظہار سمجھتے ہیں۔ چونکہ شاعر کے شعری رویّہ کے ساتھ اس کے شعری اسلوب کا تعلق بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس لیے موصوف کا یہ شعر ان کے شعری اسلوب کے تنقیدی تجزیے کے سلسلے میں بھی بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے:۔

اظہار ہے دردِ دل کا بسملؔ
الہام نہ شاعری فسوں ہے

▲▲

راہی شہابی

فکر و فن کی سلسبیل

حضرتِ بسمل سعیدی کے لیے فکرِ سخن
کیسے ہو ممکن کہ ہے معذور اس میں میرا فن
میں کہ خاکِ زیرِ پا اور وہ کہ صدرِ انجمن
میں کہ ننگِ گلستاں وہ باعثِ فخرِ چمن
آج کے دن پھر بھی کب خاموش رہ سکتا ہوں میں
مختصر الفاظ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں میں

مولوی سید سعید احمد کا فرزندِ جلیل
موجِ دریائے تغزل فکر و فن کی سلسبیل
ذات جس کی عظمتِ علم و ہنر پر اک دلیل
حاملِ حسنِ تفکر جس کے افکارِ جمیل
جس کے دم سے رتبۂ فنکار و فن محفوظ ہے
دولتِ گنجینۂ شعر و سخن محفوظ ہے

جس کی آنکھیں نم مگر لب پر تبسم گل فشاں
پاؤں جس کے شل مگر جو روز و شب پیہم رواں
یورشِ آلام جس پر الحفیظ والاماں
پھر بھی جس کا عزم محکم جو صلے جس کے جواں
جو الم سے کیف چاہے غم سے جو چاہے نشاط
خود الٹ دی جس نے بڑھ کر رنج و راحت کی بساط

وہ پرستارِ شہہِ کونین ابنِ بو تراب
خاکدانِ تیرہ سے ابھرا جو مثلِ آفتاب
ہم نشین و ہمدمِ دیرینۂ جوشؔ و شہابؔ
ہے جہانِ شاعری میں خود ہی جو اپنا جواب
اک مرادؔ اُس کا نہ تنہا شاد ہے مسرور ہے
اُس کے میخانے میں جو میکش ہے وہ مخمور ہے

جس پہ نازاں کائناتِ شیشہ و جام و سبو
گلشنِ اُردو کو بخشا جس نے حسنِ رنگ و بو
جس کے چرچے انجمن در انجمن ہیں کو بہ کو
جس کے نغمے "یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو"
گم جو خلدِ عشرت و کیفِ مجسم میں رہا
مدتوں جو نغمہ خواں بزمِ مکرمؔ میں رہا

حضرتِ صولتؔ کے غم میں جس کا دل مغموم ہے
نوحہ خوانِ اخترؔ شیرانیِ مرحوم ہے
متاؔج سے جس کی محبت ظاہر و معلوم ہے
حال، جس کا اک نشانِ ماضیِ معدوم ہے

یادگارِ عظمتِ پارینۂ محفل ہے یہ
سرزمینِ ٹونک! تیرا آخری بسملؔ ہے یہ

▲▲▲

آئیے
اپنے بچّوں کے مستقبل کو
روشن بنائیں

ہمارے ملک میں فیملی پلاننگ کا پروگرام عوامی فلاح و بہبود کے وسیع تر پروگرام کا لازمی جزو ہے۔ بلکہ فیملی پلاننگ پروگرام شروع کرنے کا مقصد ہی عوامی فلاح و بہبود ہے۔ کنبے کو چھوٹا رکھنے کی ضرورت پر اس لیے نہیں زور دیا جا رہا کہ ہمیں بچے پسند نہیں بلکہ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ہر بچّے کو زندگی میں ترقّی کرنے کے بہترین مواقع ملیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے بچّوں کو ایک بہتر دنیا ورثے میں دیں۔ ہر ماں باپ کی یہی خواہش ہوتی ہے اور ہماری منصوبہ بند ترقّی کا بھی یہی مقصد ہے۔

—— اندرا گاندھی

DAVP 75/325

راجستھان کے مایۂ ناز فرزند اور نامور شاعر

حضرت بسمل سعیدی

کے لیے

نیک تمنّاؤں کے ساتھ

راجستھان میں ہندی، اردو، سنسکرت اور راجستھانی زبانوں کا ادبی ادارہ

راجستھان ساہتیہ اکیڈمی (سنگم)، اودے پور

نوجوان شاعر خلش دہلوی کی

تازہ شعری پیشکش

یہ قربتیں یہ دوریاں

محبت کی گوناگوں کیفیات کا

بے ساختہ شعری اظہار

قیمت: دس روپے

ہنگامی حالات میں آپ کیا کریں؟

بیوپاری ——— پیداوار اور تقسیم میں توازن بنائے رکھیں ضروری چیزوں کی قیمتوں کی عام سطح بنائے رکھیں

کسان ——— زیادہ سے زیادہ کھیتی کی پیداوار بڑھائیں اپنی پیداوار عوام الناس کو دستیاب کرائیں۔

مزدور ——— محنت لگن اور ایمانداری سے کام کرتے ہوئے پیداوار میں اضافہ کریں ● مزدور مالک تعلقات خوشگوار بنائے رکھیں۔

دانشور ——— نئے حالات کی ضرورتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے نئے سماج وادی سماج کے بنانے میں تعاون دیں۔

افسر اور کارکن ——— عام جنتا کو اپنا تعاون دیں ● کل کا کام آج اور آج کا کام ابھی کریں

طالب علم ——— پوری لگن سے پڑھیں ● قوم کی تعمیر کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں ●

گرہستن ——— غیر ضروری چیزیں جمع نہ کریں ● فضول خرچی روکیں۔

جاری کردہ: راجستھان سرکار D.P.R/D 123/75



गुलाग द्वीपसमूह

(हिन्दी में)

सम्भवतः वर्तमान युग की महानतम रचना और सत्य की प्रखरता ने इसे यह महानता प्रदान की है।

लाइब्रेरी संस्करण 20/-

विद्यार्थी संस्करण 7/-

दिल्ली . 110006

تحریک دہلی — بسمل سعیدی نمبر — دسمبر ۷۵ء

قومی بچتوں میں سرمایہ لگانے والوں کے لیے

خوشخبری

نئے ۱۰ سالہ انیوئٹی سرٹیفکیٹ

جن پر
کھاتے دار کو ۱۲۰ مہینوں کے لیے سود کی رقم ہر مہینے ملتی رہے گی جس سے اسے اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم وغیرہ کے اخراجات پورے کرنے میں مدد ملے گی۔

میعاد پوری ہونے پر خاصے پریمیم کے ساتھ سرمایہ کی واپسی (۱۰٫۲۵٪ سود مرکب ملے گا)

ٹیکس سے مستثنیٰ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ خریدنے کی حد بڑھا دی گئی ہے

	پہلی حد	موجودہ حد
ایک بالغ کے لیے	۵۰٫۰۰۰ روپے	۷۵٫۰۰۰ روپے
دو بالغوں کے لیے (مشترکہ)	۱۰۰٫۰۰۰ روپے	۱۵۰٫۰۰۰ روپے

(ان سرٹیفکیٹوں پر ۶٪ سالانہ ٹیکس سے مستثنیٰ سود ملتا ہے)

۵ سالہ ریکرنگ ڈپازٹ کھاتوں کے لیے مزید فائدے

پانچ سال کے بعد بھی رقم جمع کرانے کا سلسلہ جاری رکھا جا سکتا ہے یا میعاد پوری ہونے پر ملنے والی رقم مزید عرصے کے لیے سرکار کے پاس جمع رکھی جا سکتی ہے۔
(ایسی حالتوں میں ہر پورے سال کے لیے ۹٫۲۵٪ سود مرکب دیا جائے گا)

بچتوں کے تحفظ کی اسکیم کا فائدہ اب ۲۰ روپے کے کھاتوں پر بھی دیا جائے گا۔

مزید تفصیلات کے لیے براہِ مہربانی اس پتے پر لکھیے:

نیشنل سیونگز کمشنر

پوسٹ بکس نمبر ۹۶ —— ناگپور

DAVP 75/82

تیشۂ منظر

ابوالفیض سحر

کے خیال انگیز تنقیدی مضامین۔ مختلف ادبی مسائل پر سیر حاصل بحث اور جدید شاعروں میں خورشید احمد جامی، مخمور سعیدی اور بانی کے تفصیلی مطالعے۔

قیمت : آٹھ روپے

خرابہ

نظم وغزل کے صاحب طرز شاعر

من موہن تلخ

کا

تازہ ترین مجموعۂ کلام

قیمت : دس روپے

صریر خامہ

مظفر حنفی

کی

تازہ ترین غزلیں جن میں ان کے اسلوب کا تیکھا پن عروج پر ہے۔

قیمت : چھ روپے

شہپر

حرمت الاکرام

کا

منتخب کلام

ایک سوچتے ہوئے متحرک ذہن کا شعری اظہار

قیمت : آٹھ روپے

نام بہ نام

رضا نقوی واہی

کے منظوم خطوط 'ادیبوں' شاعروں اور دوسری اہم شخصیتوں کے نام۔ اُردو میں اپنی نوعیت کا پہلا شعری مجموعہ۔

مرتب : پریم گوپال متل

قیمت : چھ روپے

صحرا کی پیاس

شباب للت

کی

نظمیں، غزلیں اور گیت جن میں روایت کا حسن بھی ہے اور فکر و خیال کی تازگی بھی۔

قیمت : چھ روپے

نیشنل اکاڈمی۔ ۲/۹ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی

سیہ بر سفید

مخمور سعیدی کے دوسرے

مجموعۂ کلام

کا

نیا ایڈیشن

ترمیم و اضافے کے ساتھ

قیمت : چھ روپے

آواز کا جسم

مخمور سعیدی کا تیسرا مجموعۂ کلام

جس سے جدید شاعری

کے وزن و وقار میں اضافہ ہوا ہے۔

خوب صورت گرد پوش

قیمت : دس روپے

انتظار کی رات

کمار پاشی کی چوتھی شعری پیشکش

جو

اردو شاعری کی نئی جہتوں کی نشان دہی

کرتی ہے۔

قیمت : چھ روپے

واپس یاترا

کمار پاشی کی طویل نظم

جو

ایک منفرد انداز و آہنگ

کی حامل ہے۔

قیمت : دس روپے

نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی

سیاسی معلومات میں اضافہ کرنے والی بہترین کتابیں

تین انقلاب	فریڈرک جنشر	۱.۸۵ روپے
چین میں اسلام کا ماضی اور حال	———	۱.۳۰
ٹریڈ یونین کے بنیادی اصول	وکٹر فیدر	۱۱.۰۰
جمہوری انقلاب	برائن ماگی	۱۱.۰
روس کے انقلاب	ڈیروڈ فٹ مین	۱۱.۰۰
جمہوری سوشلزم	کانلس ریڈس	۱۱.۰۰
ٹریڈ یونینیں — ان کا جائز اور ناجائز استعمال	آرتھر باٹرلی	۱.۵۰
ببول کے پیڑ	(ایک آپ بیتی)	۱.۵۰
دو انقلاب	آر۔ ایچ بروس لاک ہارٹ	۱۱.۰۰
سوویٹ سفارت خانے میں	ایگرینڈ گرنا چیٹ	۲۱.۰۰
آج کا مارکسزم	رابرٹ کنکونٹ	۱.۷۵
آج کا چین	ڈاکٹر ایس چندر شیکھر	۱۱.۰۰
روسی انقلاب کی کامیابیاں	ڈاکٹر جان کیپ	۱.۵۰
ایک روسی سائنسداں کے تجربات سرخ چین میں	مائیکل کلوچکو	۱۱.۰۰
ادیب اور کمیسار	ازرونہ جارج پلوڑکی	۱۱.۰۰
چین کا بدلتا سماج	چو چائی اور ونبرگ چائی	۱۱.۰۰
کمیونزم اور نوآبادیت	وکٹر کولرز	۱۱.۰۰
کمیونزم اور زراعت	لارڈ والسٹن	۱.۷۵
پُر امن حملہ	ڈوگلس ہائڈ	۱۱.۰۰
خوش حالی کی تلاش	برائن کروزیر	۱.۵۰
پتھر کے دیوتا (چھ آپ بیتیاں)	مترجم، گوپال متل	۱۱.۰
اتحاد — ہماری ہار	ڈگلس ہائڈ	۱۱.۰۰
تعلیم کی کھوج	———	۱.۷۵

نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی

جسموں کا بن باس

آزاد گلاٹی

کا

دوسرا مجموعۂ کلام

جسے

تمام ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔

قیمت: آٹھ روپے

تکون کا کرب

آزاد گلاٹی

کی

نظمیں اور سانیٹ

حقیقت اور رومان

کا

سنگم

قیمت: پانچ روپے

شہرِ خوشبو

نور تقی نور

کی

تیس سالہ شاعری

کا

عطر

قیمت: پانچ روپے

اعتراف

جواں فکر شاعر

عبدالرحیم نشتر

کی

غزلوں کا

اولین انتخاب

قیمت: چار روپے پچاس پیسے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے

احتشام اختر

کا

پہلا شعری مجموعہ

راکھ

خوشنما گیٹ اپ

قیمت: چھ روپے

راہگذر

دل ایوبی

کی

منتخب غزلیں

اُردو غزل کی معتبر روایت

کی

نئی توسیع

قیمت: چار روپے پچاس پیسے

نیشنل اکاڈمی۔ ۹ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی

گوپال مِتّل کی ادبی اور سیاسی یادداشتوں کی
حکایتِ لذیذ

لاہور کا جو ذکر کیا

(کچھ آپ بیتی، کچھ جگ بیتی)

غیر منقسم پنجاب کی کہانی —— گوپال مِتّل کی زبانی

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

قیمت: چھ روپے

گوپال مِتّل کا شعری مجموعہ

صحرا میں اذان

اُردو شاعری کی مستحکم اور مُعتبر آواز

آفسٹ کی چھپائی

اعلیٰ گیٹ اَپ

قیمت: چھ روپے

شیرازہ

آزادی کے بعد کا سب سے اہم شعری انتخاب

۲۲۹ ممتاز شعراء اور شاعرات کا منتخب کلام — سوانحی اشاروں کے ساتھ۔

مرتبین:- مخمور سعیدی
پریم گوپال مِتّل

مضبوط جلد، خوشنما گیٹ اَپ، سائز ۱۸x۲۲/۸، صفحات ۲۲۰

قیمت: بارہ روپے

نوبل انعام یافتہ ادیب
الیگزنڈر سولنسٹین
کا شہرۂ آفاق ناول

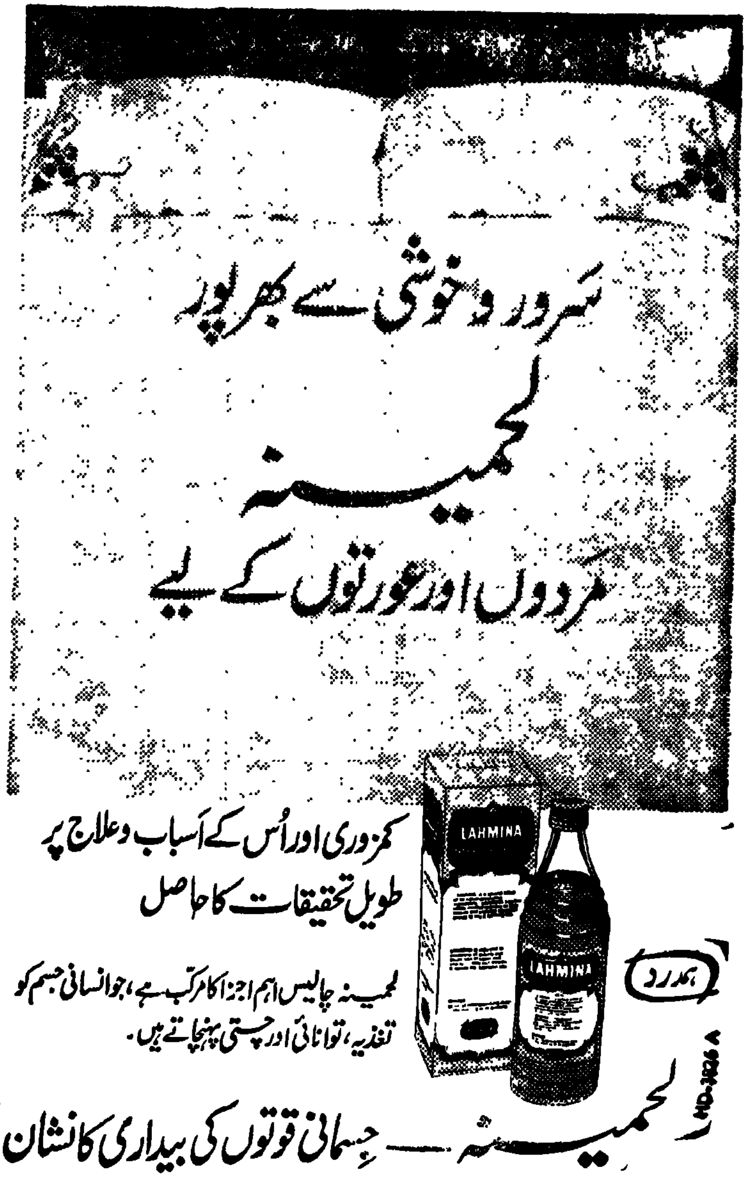
کینسر وارڈ

یہ کتاب پہلے چھوٹے سائز پر پیپر بیک میں، دو الگ الگ حصوں میں چھپی تھی۔ اس کی غیر معمولی مقبولیت کے پیشِ نظر اب اس کا ڈی لکس ایڈیشن شائع کیا گیا ہے جس میں دونوں حصے یکجا کر دیے گئے ہیں۔

ڈمائی سائز، مضبوط جلد اور بہترین گیٹ اَپ کے ساتھ۔

قیمت: اٹھارہ روپے

نیشنل اکاڈمی - ۹/ب انصاری مارکیٹ - دریا گنج - دہلی


سرور و خوشی سے بھرپور
لحمینہ
مردوں اور عورتوں کے لیے
کمزوری اور اُس کے اسباب و علاج پر
طویل تحقیقات کا حاصل
LAHMINA
LAHMINA
ہمدرد
لحمینہ چالیس اہم اجزا کا مرکب ہے، جو انسانی جسم کو
تغذیہ، توانائی اور چستی پہنچاتے ہیں۔
لحمینہ — جسمانی قوتوں کی بیداری کا نشان

Now Available on Easy Terms

WHAT ?

FOREIGN EXCHANGE LOANS

UPTO

30 Lakhs for Companies and Co-operatives and
15 lakhs for others.

FOR

Import of Capital Equipment (New or Second hand)
and Technical Know-How too.

TO

New and Existing Small & Medium scale Industries to
undertake Expansion, Diversification,
Renovation & Modernisation.

Interest : 10·5 to 11 per cent per annum

Period: Ten Years plus Liberalised Import Licensing
Policy and Cordial Service.

FROM

HIMACHAL PRADESH FINANCIAL CORPORATION
1st Floor, Kishore Bhawan, The Mall,
SIMLA-1.

Telephones: 3109 and 3552

WITH BEST COMPLIMENTS

From

GRANDLAY ELECTRICALS (INDIA)

3/4, Asaf Ali Road, NEW DELHI—110006

OFF : 27061, 272062 FACT : 228145, 228711

270572, 274211 RES : 226400

Grams : GRNDCABLE

Telex : BATRA'S 3862

On D. G. S. & D. Rate Contract,

TEL. 279475

FOR

ALL KINDS OF PAPER & BOARD
PLEASE REMEMBER

NARAIN PAPER MART

4034/3, CHAWRI BAZAR, DELHI-6

Stockists of

J.K. Paper Mills, Orient Paper Mills, Ballarpur Paper Mills, Sri Gopal Paper Misll,

---

WITH BEST COMPLIMENTS

From

FLOWMORE PVT. LTD.
K — 40,
CONNAUGHT CIRCUS,
NEW DELHI — 110001.

Always Use

J. T. C.

BLACK AND GALVANISED STEEL PIPES

for home, farm and industry
(available in 15 mm to 150 mm Dia sizes)

Manufactured with latest technique as per ISS, BSS
and other standard specifications.

MANUFACTURERS/EXPORTERS
JAIN TUBE COMPANY LIMITED,

D-20, Connaught Place, NEW DELHI-110001.

Telephone : 45841 (4 Lines) Gram : "JAINTUBES"

TELEX JTC ND-3102

Works : 13.4, Miles, Meerut Road, GHAZIABAD, (U.P.)

WITH BEST COMPLIMENTS

FROM

NIRMALA SOAP SYNDICATE

Manufacturer of

JAI MAHAVIR
&
JAI PARAS SOAP

Gali No. 9, Raghubarpura II,
Gandhi Nagar, DELHI-110031

ESPRESSO HOUSE Tel. : 272949

88, Chandni Chowk,
DELHI-110006

JAIN MISTHAN BHANDAR
Tel. : 276673

90, Dariba Kalan,
DELHI-110006

किसान को क्या चाहिए ?

- उपज का उचित मूल्य
- अधिक उत्पादन के लिए खाद
- यूरिया—सी० ए० एन०—डी० ए० पी०—एस० पी०—एम० ओ० पी० आदि
- फसल को रोगों, कीड़े मकोड़ों से बचाने के लिए कीटनाशक औषधियां
- पशुओं के लिए पौष्टिक आहार

ये सभी सुविधाएं उपलब्ध कराता है।

राजस्थान राज्य सहकारी क्रय-विक्रय संघ लि०
गोलीमार गार्डन, भवानी सिंह रोड़, जयपुर
टेलीफोन नं० ६४१३१ व ६४१३२, तार का पता--
"राजफैड"

आप भी सम्पर्क कीजिए

- सहकारी समितियों द्वारा अपनी उपज का उचित मूल्य प्राप्त करने के लिए।
- खाद उपलब्ध करने के लिए।
- संघ की आधुनिकतम फैक्ट्री द्वारा निर्मित कीटनाशक औषधियों के लिए
- उपभोक्ता भण्डारों को चीनी के लिए

विशेष

- जयपुर व अलवर में कोल्ड स्टोरेज की व्यवस्था है
- जयपुर नगर में गैस की व्यवस्था

संघ राजस्थान के उत्पादन और उपभोक्ता के बीच एक सुदृढ़ कड़ी का कार्य करना अपना उद्देश्य मानता है और अधिकताधिक आवश्यक वस्तुएं सुविधा से उपलब्ध कराता है।

महेन्द्र शास्त्री
(अध्यक्ष)

किशोरी लाल
(प्रबन्ध संचालक)

हिमाचल कला-संस्कृति-भाषा अकादमी, शिमला-९

हिमाचली लेखकों द्वारा लिखित संस्कृति, भाषा एवं इतिहास के क्षेत्र में शोध पूर्ण एवं मानक पुस्तकों की खरीद हेतु अकादमी की एक योजना के अन्तर्गत निम्न-लिखित विषयो पर गत वर्षों अर्थात प्रथम जनवरी, 1974 से 31 दिसम्बर, 1974 के दौरान छपी पुस्तकों के सम्बन्ध में सूचना आमंत्रित है :—

1 पी० एच० डी० का प्रकाशित शोध प्रबन्ध, जिसमें हिमाचल से सम्बद्ध किसी विषय पर विवेचन किया गया हो। (एक पुस्तक)

2. शोध पूर्ण पुस्तक जिसे किसी डिग्री के लिए प्रस्तुत न किया गया हो। (एक पुस्तक)

3. हिमाचल की आदिम जातियों से सम्बन्धित पुस्तक (शोध ग्रन्थ अथवा उसी स्तर की कोई मानक पुस्तक)।

4. हिमाचल की कला-संस्कृति एवं भाषा अथवा इतिहास आदि पर मानक ग्रन्थ।

इस योजना के अन्तर्गत हिमाचल कला संस्कृति-भाषा अकादमी 2500/= रुपये के मूल्य की कमीशन काट कर प्रति पुस्तक के हिसाब से प्रति वर्ष पुस्तकें खरीदती है। लेखक और प्रकाशक अपनी उक्त विषय से सम्बन्धित विचारार्थ प्रस्तुत की जाने वाली पुस्तक की कम से कम एक प्रति निःशुल्क अकादमी कार्यालय को प्रार्थना पत्र सहित भेजने का कष्ट करें। (अकादमी कार्यालय से आवेदन पत्र का फार्म प्राप्त किया जा सकता है) अकादमी द्वारा लिया गया निर्णय अन्तिम होगा। इस सम्बन्ध में विस्तृत जानकारी के लिए सम्पर्क स्थापित करें।

सचिव
हिमाचल कला-संस्कृति-भाषा अकादमी
परिमहल, शिमला-9, (हि० प्र०)
Tel. No. 2651

57828

बाबू जगजीवन राम जी के
विचारों का संग्रह



विचार मंथन

बाबू जी के सुलझे विचारों महत्व-पूर्ण भाषणों एवं प्रेरणादायक लेखों को डा. ईश्वर प्रसाद वर्मा ने सम्पादित कर एक अनुपम साहित्य का सृजन कर दिया है। 30/=

सेना और सेनानी

सेना की सम्पूर्ण जानकारी और सैनिकों के अदम्य साहस, शौर्यता तथा विजयाभियान की रोमांचकारी गौरव-गाथा जो स्वर्णिम इतिहास बन गई है। डा. ईश्वर प्रसाद वर्मा 10/-

पी. के. पब्लिकेशन्ज
11, गोल्छा मार्केट, प्रताप स्ट्रीट,
दरिया गंज, दिल्ली. 110006

Regd. No D. (D) 118
~~XXXXXXXXX~~ Phone : 271640 December 1975

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 640/57

TAHREEK

In the New Year HERO Enters a New Era !



The year 1975 heralds a new era of cycling pleasure. Incorporation of a number of improvements and innovations in the bicycle will go a long way in making "HERO 75" the smoothest-going cycle for a long long time to come.

We have now introduced new measures of excellence in quality, precision, strength and a glittering all-round finish. A whole new concept in better look and better riding. Buy "HERO-75" and feel the difference. Buy it with confidence.



"HERO 75"

THE BETTER BICYCLE
THAT'S BETTER THAN EVER

HERO CYCLES PRIVATE LIMITED, LUDHIANA